فرحت اشتیاق

پیا پھر سے کرم کریں

مکمل ناول

"بیٹا! علی تو دیر سے آنے کا کہہ کر گیا تھا۔ تم خواہ مخواہ جاگ کر کیوں تھک رہی ہو۔" پاپا کی آواز پر اس نے گردن گھما کر ان کی طرف دیکھا اور ایک دھیمی سی مسکان چہرے پر سجا کر بولی۔

"جی پاپا میں بس سونے جا رہی ہوں۔" اس کے جواب پر وہ بے اختیار مسکرا دیئے تھے۔ جانتے تھے علی کی واپسی سے پہلے اس نے سونا نہیں ہے۔

"بس تو پھر کمرے میں جا کر لیٹو۔ اتنی ٹھنڈ میں ٹیرس پر کھڑے ہونے سے سوائے بیماری کے کچھ حاصل نہ ہوگا اور علی اب کوئی چھوٹا سا بچہ نہیں ہے۔ وہ اب ایک آرکیٹکٹ ہے اور صاحب اس وقت اپنے دوستوں کے ساتھ ہلے گلے میں مصروف ہوں گے لہٰذا تم بھی اس کی فکر چھوڑو اور آرام سے سو جاؤ۔"

پاپا کی بات کے جواب میں اسے ناچار اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھانے پڑے ورنہ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ وہیں ریلنگ پر کہنیاں ٹکا کر اس کا انتظار کرتی رہے۔ اسے اس کے کمرے کے دروازے تک چھوڑ کر پاپا اپنے کمرے میں چلے گئے اور وہ اندر آ گئی۔

بیڈ پر بیٹھی وہ گھڑی کی ٹک ٹک سنتی علی کی راہ تک رہی تھی۔ ڈیڑھ بجے کے قریب گیٹ کھلنے اور پھر گاڑی اندر آنے کی آواز سنائی دی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ سیڑھیوں پر علی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تو وہ اس کی ناراضی کے خوف سے جلدی سے بیڈ پر لیٹ گئی۔ اسی وقت وہ اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آیا اور اسے جاگتا دیکھ کر خفگی بھرے انداز میں بولا۔

"پتا تھا مجھے آپ جاگ رہی ہوں گی۔ سارا وقت اسی ٹینشن میں گزر گیا کہ آپ میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ حالانکہ آپ نے مجھ سے پرامس کیا تھا کہ سو جائیں گی۔"

وہ اس کے پھولے ہوئے منہ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

"تو تمہارے انتظار میں کون جاگ رہا ہے۔ تو میں فلم دیکھ رہی تھی جو ابھی ختم ہوئی ہے۔"

"اب آپ مجھ سے جھوٹ بھی بولا کریں گی۔" علی نے بڑے افسوس سے کہا۔

"پری آپ میرے لیے خود کو اتنی اذیت دیتی ہیں، مجھے اس وقت بڑی سخت شرمندگی ہو رہی ہے۔" اس کے پاس بیٹھا ہوا بولا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے بال اپنے ہاتھوں سے بکھیرتے ہوئے شرارتی انداز میں بولی۔

"میرا خیال ہے کہ شرمندہ صاحب اب آپ خود بھی سو جائیں اور مجھے بھی سونے دیں۔ باقی کا افسوس وغیرہ کل کے لیے اٹھا رکھیں۔" وہ اس کی بات کا جواب دیے بنا کمرے سے چلا گیا تو وہ خود بھی دوبارہ سے لیٹ گئی۔

♥ ♡ ♥

"ممی یہ بلینکٹ کتنا خوبصورت ہے۔" تانیہ کی آواز پر عمیرا نے بیگ میں سامان رکھتے ہوئے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دیں۔ وہ بیڈ پر بکھرے تمام سامان کو بڑے شوق اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کپڑے، سویٹر، موزے، ٹوپے، جوتے، بے بی بلینکٹس اور ضرورت کی دیگر چیزیں جو عمیرا بیگ میں رکھ رہی تھیں وہ ان تمام چیزوں کو بڑی محبت سے بچی کی خوشی سے جھلملاتا چہرہ دیکھنے لگی تو اس کی خود پر مرکوز نگاہیں محسوس کر کے عمیرا نے بیگ کو ایک طرف رکھ دیا اور اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"تمہی! تمہیں بھائی کا شوق ہے۔ تمہارا دل چاہتا ہے کہ تمہارا ایک بھائی ہو جس کے ساتھ تم کھیلو، شرارتیں کرو اور شور ہنگامہ مچا کر سارا گھر سر پر اٹھائے رکھو۔" ان کی بات پر اس نے اثبات میں گردن ہلا دی اور بولی۔

"جی میرا دل چاہتا ہے کہ میرا بھی کوئی بہن یا بھائی ہو۔ مجھے تو گھر میں اتنی خاموشی لگتی ہے بالکل بھی مزہ نہیں آتا۔ اب آپ اور پاپا تو ایک دم بس۔ میرا بھائی آئے گا نا، پھر تو مجھے کسی فرینڈ کے گھر جا کر کھیلنے



کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ ہم لوگ ایک ساتھ سائیکلنگ کیا کریں گے۔ ساتھ بیٹھ کر ہوم ورک کریں گے اور سوئمنگ کرنے جایا کریں گے اور اسکول بھی ایک ساتھ جایا کریں گے۔" وہ انہیں اپنے مستقبل کے پروگرام سے آگاہ کرنے لگی تو قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔

"تمہارا ارادہ تو اسے پیدا ہوتے کے ساتھ ہی اسکول لے جانے کا لگ رہا ہے۔ بھئی یہ تو فاؤل ہے۔" ممی کی بات پر وہ جھینپ سی گئی جبکہ وہ اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے پرسوچ انداز میں بولیں۔

"بنی! تمہیں جیلسی تو نہیں ہوگی اس سے؟"

"جیلسی کس بات کی ممی؟" وہ حیران ہوئی۔

"جیلسی اس بات کی کہ وہ تمہاری محبت شیئر کرنے آرہا ہے۔ آخر تمہاری ساڑھے سات سالہ حکومت کا خاتمہ کردے گا وہ۔" ممی کی بات پر وہ قدرے برامان کر بولی۔

"جی نہیں اس سے بالکل بھی جیلس نہیں ہوں گی بلکہ میں تو اس سے بہت پیار کروں گی۔ آپ سے اور پاپا سے بھی زیادہ میں اس سے پیار کروں گی۔ آپ دیکھئے گا۔"

"پتا نہیں میں دیکھ پاؤں گی یا نہیں۔" ممی کی بات اس کی سمجھ میں بالکل بھی نہیں آئی تھی اسی لئے وہ حیران ہو کر ان کا چہرہ تکنے لگی تھی جبکہ وہ کچھ چپ چپ اور الجھی ہوئی نظر آنے لگی تھیں۔

"بنی! تم مجھ سے ایک پرامس کرو گی؟" ممی نے اچانک اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پوچھا تو وہ اپنے چہرے پر بچپنے کی سی اور سادہ سی معصومیت لئے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

"تم بھائی کا ہمیشہ بہت خیال رکھو گی۔ اگر میں کہیں چلی گئی تو تم اسے کبھی بھی میری کمی محسوس نہیں ہونے دو گی۔ اس سے بہت پیار کرو گی۔ بولو بنی کیا تم ایسا کرو گی؟ Will you take care of him" وہ ان کی بات کا مفہوم ہی نہیں سمجھ پائی تھی تو کہتی کیا۔

"ممی آپ کہاں جارہی ہیں؟" کچھ دیر بعد اس نے اپنی سمجھ کے حساب سے بڑا معقول سوال کیا تو حمیرا نے ایک طویل سانس لے کر اس کے ہاتھ چھوڑ دیے اور خود کو نارمل کرتے ہوئے بولیں۔

"کہیں نہیں جانو۔ میں تو بس ایسے ہی تم سے پوچھ رہی تھی کہ تم بھائی سے کتنا پیار کرو گی۔ اب ایسا کرو تم جا کر اپنا ہوم ورک کرو۔ میں بھی سامان کی پیکنگ کر کے تھک سی گئی ہوں اس لئے تھوڑا سا ریسٹ کروں گی۔" ممی نے حسب عادت اس کے گال پر پیار کیا اور وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

اس کے جانے کے بعد حمیرا بھی بیڈ پر لیٹ گئیں اور خود کو سرزنش کرنے لگیں کہ تانیہ سے اس طرح کی بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ وہ ابھی اتنی چھوٹی اور معصوم ہے کہ ان کی بات تو کیا سمجھے گی بلکہ الٹا سہم کر ڈر جائے گی۔ مگر خود ان کا دل عجیب سے وہموں میں مبتلا تھا۔ انہیں لگتا کہ وہ ننھا فرشتہ جس کی آمد کی وہ خود سب سے زیادہ منتظر ہیں جب اس دنیا میں آئے گا تو شاید وہ خود یہاں [illegible] تمام فیلنگز کسی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کرسکتی تھیں۔ شعیب نے ان کی ایک آدھ مرتبہ کی اسی قسم کی باتوں پر سخت برہمی کا اظہار کیا تھا۔ اور انہیں وہمی اور پاگل قرار دے دیا تھا۔ بظاہر ان کے اس طرح سوچنے کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں تھی۔ ان کا کیس بالکل نارمل تھا۔ تمام میڈیکل رپورٹس اور ڈاکٹرز کی آراء بھی [illegible] تھیں مگر وہ اپنے اس دل کا کیا کرتیں جو ہر لمحے یہی کہتا تھا کہ سب کچھ ٹھیک نہیں۔ ان لوگوں کی زندگی میں ایک سانحہ رونما ہونے والا ہے۔ وہ ابھی بہت سا جینا چاہتی تھیں۔ اپنے عزیز از جان شوہر کے لئے اپنے محبتوں بھرے اس آشیانے کے لئے اور سب سے بڑھ کر اپنے بچوں کے لئے۔ مگر ان کا وجدان انہیں کسی انہونی کے ہوجانے کی پیشگی اطلاع دے رہا تھا۔

شعیب مراد جو ان کے فرسٹ کزن تھے ان سے حمیرا کی شادی خالصتاً شعیب کی پسند سے ہوئی تھی۔ وہ ان کے سگے پھوپھی زاد تھے اور ننھیال ددھیال کی روایتی

چپقلش کی وجہ سے دونوں ہی طرف سے اس شادی کی سخت مخالفت کی گئی تھی مگر شعیب کو پتا نہیں ان میں ایسا کیا نظر آیا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر اپنی اس خواہش سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے۔ ان کی ضد کے آگے آخر کار گھر والوں کو ہار ماننی ہی پڑی تھی اور یوں حمیرا بیاہ کر ان کے گھر آگئی تھیں۔ شادی کے بعد شعیب کی اپنے لئے دیوانگی دیکھ کر حمیرا حیران رہ گئی تھیں۔ وہ ان سے بے تحاشا محبت کرتے تھے اور وہ اس چاہتوں کی پھوار میں بھیگتی اپنی خوش نصیبی پر خود ہی رشک کیا کرتیں۔ شعیب ایک اچھے اور محبت کرنے والے شوہر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت ہی کامیاب اور مشہور سرجن بھی تھے۔ Transplantation میں ان کی مہارت اور ہنرمندی کے بڑے بڑے سرجنز معترف تھے۔ ان کے کریڈٹ پر بے شمار کامیاب آپریشنز تھے۔

شادی کے بعد انہوں نے اپنا ذاتی ہاسپٹل تعمیر کروایا پھر کچھ ہی عرصے میں ان کے ہاسپٹل نے اپنی ایک شناخت اور نام پیدا کرلیا۔ شادی کے ایک سال بعد تانیہ پیدا ہوئی تو وہ دونوں ہی بیٹی کی پیدائش پر بہت خوش ہوئے۔ پھر آگے پیچھے پہلے پھوپی جان اور پھر چچا جان کا انتقال ہوا تو گھر میں صرف وہ تینوں ہی رہ گئے۔ شعیب اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے باقی ان کی دو بہنیں تھیں جو شادی کے بعد کینیڈا اور امریکہ میں مقیم تھیں۔

حمیرا کو بیٹے کی شدید خواہش تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ خدا انہیں ایک بیٹے سے نواز دے۔ بس پھر ان کی فیملی مکمل ہو جائے گی۔ بیٹے کے لئے ان کا اتنا شوق دیکھ کر شعیب مسکرا دیا کرتے تھے مگر ان کی اس خواہش کی تکمیل فوراً نہ ہو سکی تھی اور اب جبکہ تانیہ ساڑھے سات سال کی ہو گئی تھی وہ دوسری مرتبہ پریگنینٹ ہوئی تھیں۔ آج کل میں کسی بھی روز انہیں ہاسپٹل چلے جانا تھا اور اسی لئے اکیلے ہونے کی وجہ سے انہوں نے خود ہی تمام تیاریاں مکمل کی ہوئی تھیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

ممی رات سے ہاسپٹل گئی ہوئی تھیں۔ وہ گھر میں ملازمین کے ساتھ تنہا تھی۔ پاپا ممی کو ہاسپٹل لے جانے کے بعد نہ تو گھر آئے تھے اور نہ ہی کوئی فون کیا تھا۔ صبح سو کر اٹھی تو دل اتنا اداس سا ہو رہا تھا کہ اس نے اسکول جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اسے پاپا پر شدید غصہ آرہا تھا جو ابھی تک آئے بھی نہیں۔ کیا وہ اپنے ننھے سے بھائی کو دیکھنے ہاسپٹل نہیں جائے گی؟ صبح سے دوپہر ہوگئی۔ وہ یونہی بوکھلائی ہوئی ادھر سے ادھر پھرتی رہی۔ فون کی بیل بجی تو اس نے دوڑ کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف پاپا کی آواز سن کر وہ خوشی سے بھرپور آواز میں بولی۔

"پاپا! میرا بھائی آگیا؟ کیسا ہے وہ؟ ممی کیسی ہیں؟" وہ ایک سانس میں کئی سوال پوچھ گئی تھی۔ اس کے سوال کے جواب میں پاپا نے اسے کریم بابا کو فون دینے کے لئے کہا تو وہ پاپا سے ناراض ہو گئی۔

"میری بات کا جواب بھی نہیں دیا۔ کریم بابا کیا مجھ سے زیادہ اہم ہیں۔" وہ دل ہی دل میں سوچتی کریم بابا کو بلا لائی۔

دوسری طرف پاپا نے پتا نہیں کیا خبر سنائی تھی کہ کریم بابا کے منہ سے بے اختیار چیخ کی صورت "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔" نکلا تھا۔

دو چار سیکنڈ وہ پاپا کی بات خاموشی سے سنتے رہے تھے اور پھر انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں ریسیور واپس رکھ دیا تھا۔ فون رکھ کر انہوں نے ایک نظر اس کے حیران پریشان چہرے پر ڈالی اور پتا نہیں کیوں ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ انہیں روتا دیکھ کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ بہت چھوٹی تھی۔ ناسمجھ اور کم عمر مگر کریم بابا کے اس طرح رونے نے اسے بری طرح سہما دیا تھا۔ جو بات اس کا دل اسے سمجھا رہا تھا وہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

کریم بابا نے اسے کھینچ کر اپنے گلے سے لگایا تو وہ تڑپ کر ان کی گرفت سے نکل گئی اور اٹھتے قدموں

چلتی ہوئی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے ایک ترحم بھری نگاہ اس پر ڈالی اور فون پر کسی کا نمبر ڈائل کرنے لگے۔ وہ سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ ان کی آوازیں سن رہی تھی۔ انہوں نے اسلام آباد ثنا کے گھر فون کیا تھا اور جو خبر وہ وہاں ان لوگوں کو سنا رہے تھے وہ اس کے کان سن تو رہے تھے مگر دل اور دماغ ان تمام باتوں کو ماننے سے انکاری تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں ان کا گھر لوگوں سے بھر گیا تھا۔ وہ سب لوگوں سے چھپ کر لان میں درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ اندر سے لوگوں کی دھاڑیں مار مار کر رونے کی آوازیں آ رہی تھیں اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ چیخ کر سب کو چپ کرا دے اور اپنے گھر سے ہاتھ پکڑ کر ان تمام لوگوں کو نکال دے۔ پھر شام سے کچھ پہلے پاپا ممی کو لے آئے تھے۔ ممی کو آتا دیکھ کر وہ بے اختیار بھاگتی ہوئی پاپا کے پاس آ گئی تھی۔ سوئی ہوئی ممی کو اس نے چیخ چیخ کر اور جھنجھوڑ کر کتنی ہی آوازیں دی تھیں مگر انہوں نے اس کی کسی بھی پکار کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اپنی گود میں ایک ننھی سی جان کو اٹھائے ہوئے پاپا نے آگے بڑھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسے اپنے سینے سے لگایا تو وہ دھاڑیں مار مار کر رو پڑی تھی۔

"پاپا! ممی میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہیں۔ وہ تو میرے لیے بھائی لینے گئی تھیں۔ آپ کہیے ناں ان سے وہ آپ کی بات مان لیں گی۔ پاپا ممی سے کہیں اٹھ کر بیٹھیں۔" وہ بلک بلک کر رو رہی تھی اور اسے دلاسا دینے کی کوشش میں شعیب خود پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے تھے۔ پھر وہ سب لوگ اس کی ممی کو پتا نہیں کہاں لے گئے تھے۔ وہ چیختی رہ گئی تھی کہ میری ممی کو کہیں مت لے جاؤ مگر اس کی التجا کسی نے بھی نہ سنی تھی۔

جس بھائی کی آمد کی وہ بھی ممی کی طرح منتظر تھی وہ آ گیا تھا مگر اس نے آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ روتی سسکتی ثنا ہی اس ننھے سے بچے کا دھیان رکھ رہی تھیں۔ پاپا خود سارا وقت کمرے میں بند رہتے تھے۔ اسی طرح [illegible] اپنے بیٹے کو غور سے دیکھا تک نہیں تھا۔

وہ ممی کے انتقال کا تیسرا دن تھا۔ وہ اپنے کمرے میں ثنا کے ساتھ سو رہی تھی۔ علی بھی وہیں ثنا کے برابر میں لیٹا پرسکون نیند سو رہا تھا۔ وہ پتا نہیں رات کا کون سا پہر تھا جب کمرے کا دروازہ کھول کر ممی اندر آئی تھیں اور دھیرے سے اسے پکارا تھا۔

"عینی!" ممی کی پکار پر وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور اپنے سامنے انہیں موجود دیکھ کر رونے لگی تھی۔

"ممی آپ ہم لوگوں کو چھوڑ کر کہاں چلی گئی ہیں۔ پلیز واپس آ جائیں۔" اس کی بات پر ممی نے اسے اپنے گلے سے لگایا تھا اور بڑے پیار سے بولی تھیں۔

"میں تو ہر وقت تمہارے ساتھ ہوں سویٹ ہارٹ۔ اور دیکھو تم تو میری بہت ہی بہادر بیٹی ہو اور بہادر بچے اس طرح تو نہیں روتے۔ اگر تم اپنے آپ کو نہیں سنبھالو گی تو میرے علی کا دھیان کون رکھے گا۔ جانو! تمہیں بھائی کا بہت زیادہ خیال رکھنا ہے۔ اتنا کہ اسے کبھی میری کمی محسوس نہ ہو۔ تم ایسا کرو گی ناں؟" ممی نے بڑی آس و امید سے اس کی طرف دیکھا تھا اور اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے گردن ہلا دی تھی۔ ممی اس کے جواب پر مطمئن ہو کر مسکرا کر کھڑی ہونے لگیں تو اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر التجائیہ انداز میں کہا تھا۔

"ممی مت جائیں پلیز! میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" وہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"عینی! تم اکیلی تو نہیں ہو۔ پاپا ہیں تمہارے پاس اور علی بھی تو ہے۔ ان دونوں کے ہوتے تم تنہا نہیں ہو۔" ممی نے اس کا ماتھا چوما تھا اور پھر اس کی پکار اور رونے کے باوجود چلی گئی تھیں۔

وہ چیخ چیخ کر ممی کو آوازیں دے رہی تھی۔ جب اس نے ثنا کی آواز سنی تھی۔ وہ اس کے برابر میں بیٹھی خوفزدہ اسے اٹھا رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو ثنا اس پر جھکی اپنے اشک چھپاتی بغور اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"بیٹا! خواب میں ڈر گئی ہو۔" ثنا نے رندھی ہوئی آواز میں کہا تو وہ بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ثنا ابھی ممی آئی تھیں آپ نے انہیں دیکھا تھا؟"

اس کی بات کے جواب میں ثنا نے روتے ہوئے اسے اپنی گود میں سر رکھ لیا تھا اور اس کا سر اپنے ہاتھ پر رکھ کر اسے اپنے برابر میں لٹا کر اس کے اوپر دعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگی تھیں۔ ثنا کہہ رہی تھیں کہ اس نے خواب دیکھا ہے مگر وہ یہ بات ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ ممی اصل میں میرے پاس آئی تھیں۔ وہ خاموشی سے ثنا کے پاس لیٹی ممی کی خوشبو محسوس کر رہی تھی۔

اسی وقت شاید بھوک کی وجہ سے علی نے رونا شروع کیا تو وہ پہلی مرتبہ اس ننھے سے وجود کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ ثنا نے فیڈر میں اس کے لیے دودھ بنایا اور بوتل اس کے منہ سے لگا دی جبکہ وہ چپ چاپ اپنے بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ اسے دودھ پلا کر ثنا [illegible] تو وہ ان کے برابر سے اٹھ کر دوسری طرف آ کر علی کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں علی کا چہرہ تھام کر اس کے [illegible] لیے تھے۔ پتا نہیں کیا ہو رہا تھا اسے وہ خود اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی مگر ایک عجیب سی محبت اور کشش تھی جو اسے اس کی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ساری دنیا سے چھپا کر اسے کہیں بہت ہی احتیاط اور محبت سے رکھے جہاں کوئی دکھ اور کوئی غم اسے چھو بھی نہ سکے۔

اب تک وہ ممی کے جانے کا ماتم کر رہی تھی مگر اب اچانک ہی اس کی سوچ اور خیالات بدل رہے تھے۔ اسے علی کو اپنے دیکھ کر بہت پیار نظر آ رہا تھا۔ اس نے تو اتنے سال تک ممی کی محبت اور چاہت سمیٹی تھی اور وہ کتنا بدنصیب تھا جسے ماں کی آغوش لمحے بھر کے لیے بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس نے دنیا میں آ کر ابھی پہلی سانس ہی لی تھی کہ اس کی ماں نے دنیا سے ناتا ہی توڑ لیا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ اپنا دکھ بھلا کے علی کے لیے دکھی ہو رہی تھی اور وہ ساری رات اس کے [illegible] روتے ہوئے گزار دی تھی۔

ممی کے چالیسویں تک ثنا وہیں رہی تھیں۔ اس دوران انہوں نے پاپا کا، تانیہ کا اور سب سے بڑھ کر علی کا بے حد خیال رکھا تھا۔ خود وہ سارا سارا دن علی کے سرہانے بیٹھی رہتی تھی۔ ثنا کو غور سے علی کے تمام کام کرتا ہوا دیکھتی رہتی تھی۔ جاتے وقت جب ثنا علی کو بھی اپنے ساتھ لے جانے لگیں تو وہ پاپا کے پاس آ گئی تھی۔

"پاپا! ثنا علی کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہیں۔" اس کی اطلاع پر پاپا نے بڑے سکون سے گردن ہلا دی تو وہ چیخ اٹھی تھی۔

"آپ اسے جانے دے رہے ہیں!"

"بیٹا! یہاں اس کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ اتنے چھوٹے بچے کو سنبھالنا آسان کام نہیں ہے۔" انہوں نے اس کا اضطراب محسوس کرتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں کہا تو وہ فوراً بولی۔

"میں رکھوں گی اس کا خیال۔" اس کی بات پر پاپا نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔

"پاپا! آپ علی کو روک لیں۔ میں نے ممی سے وعدہ کیا تھا کہ میں علی کا خیال رکھوں گی۔ اب اگر علی چلا گیا تو ممی مجھ سے ناراض ہو جائیں گی۔" وہ روتے ہوئے بولی تو ان کا دل اپنی اس بے حد حساس بیٹی کے لیے کٹ کر رہ گیا۔ وہ سمجھ سکتے تھے کہ ماں کی موت نے اس معصوم کے دل و دماغ پر کیسے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس کا سر اپنے کندھے سے لگا کر انہوں نے سمجھانے والا انداز اختیار کیا اور کتنی ہی دیر وہ اسے سمجھاتے رہے کہ ثنا کے ساتھ چلے جانا ہی علی کے حق میں زیادہ بہتر ہے اور جب وہ چاہے گی پاپا اسے اسلام آباد لے جائیں گے پھر جب علی دو چار سال کا ہو جائے گا تو وہ اسے واپس اپنے پاس لے آئیں گے۔ پاپا کے تمام سمجھانے بجھانے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا تھا اور وہ اپنی ضد پر قائم رہی تھی۔

ناچار پاپا کو اپنے رونے میں [illegible] تھی۔ ان کی ڈانٹ پر وہ چپ ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔

اس کے یکدم خاموش ہو جانے پر ان کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ وہ تو علی کی ضدی اور شرارتی تھی۔ یوں چپ چاپ سا تو اس کی سرشت میں ہی نہیں تھا۔ مگر وہ اس وقت اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے اس کی طفلانہ ضد آخر وہ کیونکر مان سکتے تھے جو محبت اور توجہ ثنا علی کو دے سکتی تھیں وہ کوئی گورنس کبھی بھی نہیں دے سکتی تھی اس لیے انہوں نے ثنا کی تجویز سے اتفاق کیا تھا اور علی کو ان کے ساتھ بھیج رہے تھے۔ حمیرا کے بغیر تو ابھی خود وہ ڈھنگ سے جی نہیں پا رہے تھے کہ کہاں گھر اور بچوں کی ذمہ داری درست طریقے سے اٹھا پاتے۔ علی ثنا کے ساتھ چلا گیا تو اس کا سکھ چین بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے کھانا پینا سب چھوڑ دیا تھا۔ بخار ایسا چڑھا تھا کہ اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس کی بیماری نے پاپا کو ہولا کر رکھ دیا تھا۔ انہوں نے ہر جتن کر لیا مگر اس کا بخار اتر کر نہیں دیا۔ یہاں تک کہ اسے ہاسپٹلائز کرنا پڑا۔

اس کی پندرہ دنوں کی بیماری نے انہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ منہ سے ایک بھی لفظ کہے بغیر ہاسپٹل کے بستر پر پڑی رہتی تھی۔ اس کی بیماری کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ آخر کار پاپا نے علی کو واپس بلوانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس چھوٹی سی بچی سے شکست کھا گئے تھے۔ علی کے واپس آنے کی دیر تھی کہ وہ ایک دم ٹھیک ہو گئی تھی۔ اس کی صحت یابی پر پاپا نے سکون کا سانس لیا تھا۔ علی کو اس کی ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کر بلوا تو لیا تھا مگر اب اس کی دیکھ بھال کا مسئلہ تھا۔ ثنا کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں آ جاتیں۔ آخر وہاں بھی ان کے بچے تھے گھر تھا اس لیے اپنی تمام تر تشویش کے باوجود وہ اس مسئلے کا کوئی حل نکالنے سے قاصر تھیں۔

پاپا نے اپنے جاننے والوں سے کسی گورنس کی دستیابی کے بارے میں بات کی تو آخر کار جلد ہی انہیں ایک خاتون میسر آ گئیں۔ چالیس پینتالیس کے لگ بھگ ان کی عمر ہو گی۔ ان کے شوہر نے انہیں اولاد نہ ہونے کے جرم میں چھوڑ دیا تھا۔ پڑھی لکھی اور اچھے گھرانے کی محسوس ہوئیں تو پاپا نے انہیں رکھ لیا۔ شاہدہ آنٹی کے آنے کے باوجود علی زیادہ وقت اسی کے پاس رہا کرتا۔ وہ اسکول سے آ کر سارا سارا دن اسے گود میں اٹھائے یہاں سے وہاں پھرا کرتی۔ وہ علی کا کوئی بھی کام کرنے سے نہیں گھبراتی تھی۔ اس کی فیڈر بنانی ہو، اس کے کپڑے بدلنے ہوں یا اس کا Pamper ہی کیوں نہ چینج کرنا ہو۔ وہ تمام کام اسی عمدگی اور چابکدستی سے کرتی کہ شاہدہ آنٹی حیران رہ جاتیں۔ علی سے اس کا والہانہ لگاؤ دیکھ کر شاہدہ کو اکثر ہی حمیرا یاد آ جاتی۔ کتنی خواہش تھی انہیں ایک بیٹے کی۔ آج وہ بیٹا موجود تھا مگر اس کے لیے ممتا کے خزانے لٹانے والی وہ ہستی نہیں تھی۔

علی چار ماہ کا ہوا تو اس نے شاہدہ آنٹی سے کہہ کر اس کے لیے سیریلیک منگوا کر انہیں مزید حیران کر دیا۔ کبھی کبھی تو انہیں ایسا لگتا جیسے وہ مفت کی تنخواہ وصول کر رہی ہیں۔ اس کے تمام کام تو وہ خود ہی کیا کرتی تھی۔ رات میں وہ علی اور شاہدہ آنٹی ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا کہ علی گیلا ہونے سے یا بھوک سے رونے لگتا اور شاہدہ آنٹی سوتی رہ جاتیں جبکہ وہ اس کی ہلکی سی آواز پر اٹھ بیٹھ جایا کرتی۔ پھر خود ہی اسے چینج کر دیتی یا فیڈر اس کے منہ سے لگا دیتی۔ جتنی دیر وہ اسکول میں ہوتی اس کا سارا دھیان علی کی طرف رہتا۔ گھر واپس آتے ہی وہ بیگ رکھے بغیر علی کے پاس آ جاتی۔

وہ خود اس سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ گھٹنوں گھٹنوں چلتا وہ ہمکتا ہوا اپنے بازو اس کی طرف پھیلاتا اور وہ اسے اپنی آغوش میں چھپا کر چوم چوم کر پیار کرتی۔ دوستوں میں، کھیلوں میں اور ٹی وی میں اس کی کسی بھی چیز میں دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ اس کی بیزارگی سے تنگ آ کر اس کی فرینڈز بھی اس سے بہت دور ہو گئی تھیں۔ وہ اپنی عمر کے حساب سے شرارتیں کرتیں، کھیلتی کودتیں اور وہ ایک طرف بیٹھی علی کے بارے میں سوچتی رہتی۔ صرف آٹھ سال کی عمر میں اس کا بچپن رخصت ہو گیا تھا۔ اب وہ صرف ایک ماں تھی علی کی ماں۔ اس کا دھیان رکھنا اس کی ضرورتوں کا خیال رکھنا اسے علی کے علاوہ وہ کچھ سوچا ہی نہیں کرتی تھی۔

شروع شروع میں علی کے بارے میں اس کا اتنا پوزیسو ہونا پاپا نے ماں کی جدائی کا صدمہ سمجھ کر برداشت کر لیا مگر اب تو انہیں رخصت ہوئے ایک سال ہونے کو آیا تھا اور اس کی دیوانگی بجائے کم ہونے کے بڑھتی جا رہی تھی۔ پہلے پہل انہوں نے اسے پیار محبت سے سمجھایا کہ اسے اپنی فرینڈز کے ساتھ بھی کچھ وقت گزارنا چاہیے اسے دوسرے بچوں کی طرح کھیل کود میں دلچسپی لینی چاہیے مگر جب اس نے ان کی کسی نصیحت پر کان نہ دھرے تو انہوں نے اپنے رویے میں سختی پیدا کر لی۔ وہ ان کے کہنے پر کھیلنے تو چلی جاتی مگر وہ دیکھتے تھے کہ اس کے چہرے پر خوشی کا کوئی رنگ نہیں ہوتا تھا۔ وہ کھیل کر واپس آتی تو پاگلوں کی طرح علی کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگتی۔

پاپا اس کی حالت دیکھ کر ڈر سے گئے کیا ان کی بیٹی ابنارمل تو نہیں ہو رہی۔ بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اسے کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھانا چاہیے۔ اس کے ساتھ کافی ساری سیٹنگز کرنے کے بعد سائیکاٹرسٹ نے پاپا سے کہا کہ انہیں تشویش میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ صرف یہ ہے کہ ان کی بچی عام بچوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی حساس ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کا رویہ بتدریج نارمل ہوتا چلا جائے گا۔ زور زبردستی سے یا کسی بھی قسم کا پریشر ڈالنے سے اس کے اعصاب پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ خود ٹھیک ہو جائے گی اور یوں پاپا نے اس کی دیوانگی کے ساتھ سمجھوتا کر لیا تھا۔

اس کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا۔ پرائز ڈسٹری بیوشن میں پاپا آئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح اس نے اس بار بھی اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن لی تھی۔ اپنی ٹرافی، گفٹس اور رپورٹ کارڈ اٹھائے وہ پاپا کے پاس آئی تو انہیں لگا کہ شاید وہ ابھی ہسٹریک ہو کر رونا شروع کر دے گی۔ اس کے اسکول میں ہونے والی پیرنٹس ٹیچرز میٹنگ ہوتی یا سالانہ فنکشن ہمیشہ ممی ہی آیا کرتی تھیں۔ پاپا ہر بار وعدہ کرنے کے باوجود غائب ہو جاتے اور بعد میں ممی ان سے خوب لڑتی تھیں کہ انہیں اپنی اکلوتی بیٹی کی اسٹڈیز میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس لیے انہیں لگا تھا کہ وہ حمیرا کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے شاید رونا شروع کر دے گی مگر ان کی توقعات کے برخلاف وہ آرام سے مسکراتی ہوئی انہیں اپنی رپورٹ کارڈ اور گفٹس دکھانے لگی تو انہوں نے بھی سکون کا سانس لیا۔ اپنی لاڈلی بیٹی کی آنکھوں میں آنسو وہ کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔

وہ سارا دن اس نے پاپا، علی اور شاہدہ آنٹی کے ساتھ باہر گھومتے پھرتے گزارا تھا۔ پاپا نے اسے بہت ساری شاپنگ کرائی، کھلونے دلائے اور اس کی پسند کا ڈنر کرایا۔ وہ خوش تھے کہ تابیہ بہل گئی ہے اور اس کی خاطر انہوں نے اپنے موڈ کے خلاف تمام دن گھر سے باہر گزارا تھا۔

رات سونے سے پہلے وہ ایک نظر علی اور تابیہ کو دیکھنے ان کے بیڈ روم میں آئے تو تابیہ کو بستر سے غائب پا کر وہ کچھ پریشان سے ہو گئے۔ باتھ روم کی لائٹ بھی بند تھی۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے لاؤنج کی طرف جانے لگے تو اسٹڈی روم کی لائٹ جلی دیکھ کر وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ اسٹڈی روم میں فلور کشن پر سر رکھے وہ بے خبر سو رہی تھی۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتے اس کے پاس آ گئے۔ وہ گہری نیند میں سو رہی تھی۔ چہرے پہ پھیلی آنسوؤں کی لکیریں بتا رہی تھیں کہ وہ روتے روتے سوئی ہے۔ اس کے سینے پر ایک ڈائری اوندھی رکھی ہوئی تھی شاید وہ سونے سے پہلے کچھ لکھتی رہی تھی۔ وہ اس کے پاس کارپٹ پر بیٹھ گئے اور بڑے آرام سے ڈائری اس کے ہاتھ میں سے نکال کر اٹھالی۔ پوری ڈائری خالی تھی۔ صرف پہلے ایک دو صفحوں پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے ڈائری پڑھنی شروع کی۔

"میری پیاری ممی!

آج میں نے آپ کو بہت مس کیا۔ آپ کو پتا ہے

میں نے اس بار بھی اپنی کلاس میں فرسٹ پوزیشن لی ہے۔ آڈیٹوریم میں بیٹھے پاپا کو دیکھ کر میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر رو دوں۔ یاد ہے لاسٹ ایئر میرے رزلٹ والے دن پاپا وعدہ کرنے کے باوجود نہیں آئے تھے اور ہم دونوں ہی ان سے سخت خفا ہو گئے تھے۔ پھر رات میں پاپا نے ہم دونوں سے ایکسکیوز کیا تھا اور ہم لوگ ایک ساتھ ڈنر کرنے گئے تھے۔ آج پاپا میرے کہے بغیر خود ہی آ گئے تب بھی میرا دل بہت سارا رونے کو چاہ رہا تھا۔ مگر میں نے اپنے اوپر کنٹرول کیا اگر میں روتی تو میرے رونے سے پاپا پریشان ہو جاتے۔ میں پاپا کو اپنی وجہ سے دکھی نہیں کرنا چاہتی۔ وہ پہلے ہی اتنے اپ سیٹ رہتے ہیں۔ میں انہیں اپنی وجہ سے اور ٹینشن کیوں دوں۔ ممی! پاپا بالکل چینج ہو گئے ہیں وہ ہر وقت چپ چاپ رہتے ہیں اب نہ تو وہ آفاق انکل کے ساتھ گالف کھیلنے جاتے ہیں اور نہ ہی مدثر انکل کے ساتھ جم خانہ جاتے ہیں۔ ہاسپٹل سے آکر وہ سارا وقت میرے اور علی کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔ وہ میرا اور علی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ممی آپ کیوں چلی گئیں۔ آپ کے بغیر میں، پاپا اور ہمارا گھر سب ہی بہت اداس ہیں۔

پتا ہے ممی پچھلے مہینے نرگس پھپھو پاکستان آئی تھیں۔ ہم لوگوں سے ملنے آئیں تو مجھے دیکھ کر کہنے لگیں کہ "ارے نابیہ تو ہو بہو حمیرا کی کاپی ہے۔" مجھے ان کی بات سن کر بہت خوشی ہوئی۔ ممی آپ بتائیں کیا میں واقعی آپ کے جیسی ہوں؟ آپ تو اتنی خوبصورت تھیں اتنی پیاری اور چارمنگ سویٹ ممی! علی کا میں بہت خیال رکھتی ہوں وہ اب بہت شرارتی ہو گیا ہے اور مجھے تو ایک منٹ کے لیے بھی نہیں چھوڑتا۔ شاہدہ آنٹی بتا رہی تھیں کہ جب میں اسکول میں ہوتی ہوں علی اس وقت گھٹنوں گھٹنوں چلتا مجھے پورے گھر میں تلاش کرتا ہے۔ میرے پاس سے وہ کسی کی بھی گود میں نہیں جاتا۔ یہاں تک کہ پاپا کے پاس بھی نہیں۔ اچھی ممی! پلیز آج آپ مجھے خواب میں نظر آ جائیں میری اسلامیات کی ٹیچر میڈم مریم بتا رہی تھیں کہ اللہ میاں کو جو لوگ بہت اچھے لگتے ہیں وہ انہیں اپنے پاس بلا لیتے ہیں۔ وہاں آسمان پر اللہ میاں نے ایک بہت خوبصورت جنت بنائی ہے۔ ممی آپ کو جنت میں مزہ آتا ہے؟ وہ جگہ کیا بہت ہی خوبصورت ہے؟ کیا ہمارے گھر سے بھی زیادہ؟ پلیز ممی تھوڑی سی دیر کے لیے اپنی جنت سے مجھے ملنے آ جائیں۔ میں خواب میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ پلیز۔"

وہ ڈائری ایک طرف رکھ کر اب بغور اسے دیکھ رہے تھے۔ آنسوؤں سے بھیگے چہرے پر مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ خواب میں اپنی ماں کی آغوش میں چھپی اپنے دل کی تمام باتیں انہیں بتا رہی ہے۔ اس کے دکھ پر وہ اپنے اشک بمشکل روک پائے تھے۔ ان کی بچی اتنی حساس اور مختلف ہوگی اس کا زیادہ اندازہ انہیں آج سے پہلے کبھی نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ وقت رفتہ رفتہ بہل رہی ہے۔ مگر وہ تو دھیرے دھیرے اپنے خول میں سمٹتی جا رہی تھی۔ سو وہ اتنی چھوٹی سی لڑکی اپنی فیلنگز ان سے چھپائے اپنے خول کو ہی سے جا رہی تھی۔ انہوں نے جھک کر اس کے ماتھے پر پیار کیا اور اسے اپنے بازوؤں میں اٹھائے اپنے بیڈ روم میں لے آئے۔

پھر انہوں نے اس کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر بہت ساری باتیں کرتے۔ ممی کے بارے میں، علی کے بارے میں اور خود اس کے اپنے بارے میں۔ اس کی خوشی کی خاطر انہوں نے دوبارہ سے جم خانہ جانا شروع کر دیا۔ علی اور وہ بھی ان کے ساتھ جاتے۔ جس طرح پہلے ممی سے اس کی بہت دوستی تھی اسی طرح اب پاپا سے اس کی بہت دوستی ہو گئی تھی۔ وہ اپنی کوئی بھی بات ان سے نہیں چھپاتی تھی۔ ان کی بہنوں نے اور خاندان کے دوسرے افراد نے انہیں دوسری شادی کا مشورہ دیا تھا جسے انہوں نے بغیر کوئی اہمیت دیئے فوراً رد کر دیا۔ کوئی دوسری عورت حمیرا کی جگہ لے ہی نہیں سکتی تھی۔ انہوں نے ازدواجی زندگی کے سات سال اتنے بھرپور اور خوشگوار گزارے تھے کہ وہ ان کی یاد

میں ساری زندگی بتا سکتے تھے۔ ان کی زندگی کا محور اب صرف اور صرف ان کے بچے تھے۔ ان کا پروفیشن اور ان کے بچے ہی اب ان کے جینے کا بہانہ تھے۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ علی ڈھائی سال کا ہوا تو پاپا نے اسے مونٹیسوری میں داخل کروا دیا۔ علی کے لبوں نے جو پہلا نام پکارا وہ "بجو" تھا۔ توتلے لبوں سے نکلے اس "بجو" پر اسے بے حد پیار آتا تھا۔ وہ اور علی دونوں ہی اسکول چلے جاتے۔ واپس آکر وہ علی کے کپڑے بدلواتی اس کا منہ ہاتھ دھلاتی پھر اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا بنا کر کھانا کھلاتی۔ وہ کھانے پینے کے معاملے میں بہت نخرے دکھاتا تھا۔ شاہدہ آنٹی کے کہنے پر وہ ان کی بنائی کوئی بھی چیز نہیں کھاتا تھا۔ بس پورے گھر میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی۔ بڑی مشکلوں سے اسے کھانا کھلانے میں کامیاب ہوتی۔ شاہدہ آنٹی کو دیکھ دیکھ کر اس نے بھی تھوڑا بہت پکانا سیکھ لیا تھا۔ اس لیے کبھی کبھی وہ علی کے لیے اپنے ہاتھ سے سینڈوچ بناتی، کبھی کھچڑی اور کبھی دلیہ۔ اس کوشش میں اکثر اوقات اس کے ہاتھ جل جاتے مگر وہ تکلیف کی پروا نہیں کرتی تھی۔

ایک دو مرتبہ پاپا کی نظر اس کے جلے ہوئے ہاتھ پر پڑ گئی تو انہوں نے شاہدہ آنٹی کی خوب خبر لی کہ وہ بچی سے اتنی غافل رہتی ہیں۔ اسے بھی پاپا نے سخت تنبیہ کی کہ چولہے میں نہیں گھسنا۔ مگر وہ اس دل کا کیا کرتی جو علی کی خدمت کرنے کے لیے مچلتا رہتا تھا۔ یوں وہ پاپا اور شاہدہ آنٹی سے چوری چھپے اکثر ہی علی کے لیے کچھ نہ کچھ بنا لیتی۔

علی چار سال کا ہوا تھا تو وہ ساتویں کلاس میں آ گئی تھی۔ انہیں دنوں شاہدہ آنٹی کو ان کے بھائی نے اپنے پاس جدہ بلا لیا تو وہ اپنے بھائی کے پاس جدہ چلی گئیں۔ ان کے جانے سے پاپا ایک مرتبہ پھر پریشان ہو گئے۔

بچے ان سے مانوس ہو گئے تھے۔ فوری طور پر ان کا نعم البدل ملنا انہیں مشکل نظر آ رہا تھا مگر یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ شاہدہ آنٹی کے چلے جانے کے باوجود گھر میں اور بچوں کی زندگی میں کہیں کوئی بے ترتیبی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ صبح نابیہ کو اسکول کے لیے اٹھانے آئے تو وہ انہیں پہلے سے جاگی ہوئی ملی۔ جلدی جلدی خود تیار ہو کر علی کو بھی اسکول کے لیے تیار کرواتی۔ اس کے بیگ وغیرہ چیک کرتی اور پھر علی کا ہاتھ پکڑ کر ناشتے کی میز پر آکر بیٹھ جاتی۔ کھانا پکانے کا تو کوئی مسئلہ نہ تھا کریم بابا پرانے ملازم تھے کھانا پکانا اور گھر کے بیشتر امور انہیں کی نگرانی میں انجام پایا کرتے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کی سمجھداری اور مجبور انداز کو دل ہی دل میں سراہ کر کچھ مطمئن ہو گئے اور یہی سوچا کہ جب بھی کوئی اچھی خاتون ملیں انہیں رکھ لیں گے۔ جلد بازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ علی کو انہوں نے اپنے پاس سلانا چاہا تو نابیہ نے منع کر دیا۔

"پاپا مجھے علی کے بغیر نیند نہیں آئے گی۔" خود علی نے بھی اسی کے پاس سونے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ بچوں کی بات مان گئے۔ رات میں بچوں کو دیکھنے آتے تو علی اس کے بازو پر سر رکھ کر سوتا نظر آتا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لپٹا کر گہری نیند سوتی ہوئی ملتی۔ وہ بہن بھائی کا ایک دوسرے سے اتنا پیار اور یگانگت دیکھ کر سرشار سے ہو جاتے۔ خدا نے انہیں کتنی اچھی اولاد سے نوازا تھا۔ وہ اپنے رب کا جتنا بھی شکر ادا کرتے کم تھا۔

اس رات روزانہ کی طرح وہ علی کو کہانی سنا رہی تھی۔ روز رات کو سونے سے پہلے وہ اس سے کہانی سنتا تھا۔ کبھی وہ اسے سنڈریلا کی کہانی سناتی، کبھی سنو وائٹ، کبھی سلیپنگ بیوٹی اور کبھی جیک اینڈ دا بین اسٹاک کی۔ کہانی سنتے سنتے اچانک علی نے اس سے سوال کیا تھا۔

"بجو! پری کیسی ہوتی ہے؟" وہ اس کے سوال پر مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

"پری بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ وہ بڑی ہمدرد اور نیک ہوتی ہے۔" وہ اس کے ہاتھ پر سے اپنا سر اٹھا کر بولا تھا۔

"کتنی خوبصورت ہوتی ہے؟ کیا آپ کے جتنی؟"

وہ چار سال کی عمر میں بلا کا ذہین اور سمجھدار تھا۔ وہ

اس کے سوال جواب پڑھتے ہوئے بولی تھی۔

"علی! کیا میں خوبصورت ہوں؟"

"ہاں!" وہ سنجیدہ شکل بنا کر بولا۔

"بتائیں ناں بجو! پری آپ کے جیسی خوبصورت ہوتی ہے؟" وہ اپنا سوال بھولا نہیں تھا۔

"پتا نہیں بھئی۔ میں نے کبھی اصل میں کوئی پری دیکھی تھوڑی ہے۔ بس سنا ہے کہ پریاں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا تو علی نے کہا۔

"بس پھر اب میں آپ کو بجو نہیں کہوں گا۔ آپ تو پری ہیں۔" وہ علی کی بات پر ہنس پڑی تھی اور اس روز کے بعد سے علی نے اسے بجو کے بجائے پری کہنا شروع کر دیا تھا۔ شروع شروع میں وہ اس نام پر بہت چڑی تھی۔ علی کو منع بھی کیا تھا۔ جتنا وہ چڑتی وہ اتنا ہی اسے پری کہتا۔ پاپا کی عدالت میں اس کا مقدمہ پہنچا تو وہ اس کی ناراض شکل دیکھ کر ہنس پڑے تھے اور بجائے علی کو منع کرنے کے الٹا اسے شاباش دینے لگے تھے کہ اس نے تابندہ کے لیے بڑا ہی مناسب نک نیم تجویز کیا ہے۔

پاپا کی حمایت پا کر علی اور شیر ہو گیا تھا۔ بالآخر اسے اس نک نیم سے سمجھوتا کرنا ہی پڑ گیا تھا۔ اسے لگتا کہ اگر علی نے کسی اور کے سامنے اسے اس نام سے پکارا تو ضرور اس کا مذاق بنے گا۔ مگر ایسا کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ ہر کوئی علی کو سراہتا کہ اس نے تابندہ کے لیے بہت اچھا نام منتخب کیا ہے۔

وہ اپنے ساتھ بٹھا کر علی کو ہوم ورک کراتی۔ اس کی پڑھائی کے معاملے میں وہ بہت زیادہ دلچسپی لیتی۔ شام میں پاپا گھر واپس آتے تو وہ دونوں انہیں بک پھیلائے پڑھتے ہوئے نظر آتے۔ تابندہ تو تھی ہی بہت سمجھ دار۔ انہیں کبھی بھی اسے پڑھائی کے بارے میں کوئی تاکید کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی مگر اس معاملے میں علی بھی بہن کے ہم قدم بلکہ اس سے دس قدم آگے ہی تھا۔ وہ بے تحاشا ذہین تھا۔ اپنے ہم عمر بچوں کے مقابلے میں اس کی ذہانت اور لیاقت کے سب ہی قائل تھے۔ ہوم ورک کرنے کے بعد علی اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے چلا جاتا تو وہ پاپا کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے لگتی۔

وہ جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی اسے اپنے پاپا سے اور بھی زیادہ محبت ہونے لگی تھی۔ وہ کتنے اچھے تھے۔ اس کی ممی کے مرنے کے بعد وہ ان لوگوں کے لیے اسٹیپ مدر لے کر نہیں آئے تھے۔ ان کے بیڈ روم میں آج بھی اس کی ممی کی انلارج تصویر لگی ہوئی تھی۔ اسے پاپا کی تنہائی پر بہت افسوس ہوتا۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ اتنا تو سمجھ سکتی تھی کہ پاپا خود کو کتنا اکیلا سمجھتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کا اتنا دھیان رکھتے ہیں مگر خود ان کا دھیان رکھنے والا کون تھا؟ اس نے دھیرے دھیرے علی کی طرح پاپا کا بھی خیال رکھنا شروع کر دیا۔

ان کے کپڑے وارڈ روب میں ہینگ کر کے رکھتی۔ ٹائیاں، موزے اور رومال سلیقے سے الگ جگہ رکھتی۔ ممی کے بغیر پاپا کی زندگی میں کتنی بے ترتیبی آگئی تھی کہ اب صبح جب پاپا ہاسپٹل جانے کے لیے تیار ہو رہے ہوتے وہ ان کی تیاری میں مدد کرانے ان کے کمرے میں آجاتی۔ ان کی ٹائی کی ناٹ بنا کر دیتی۔ ان کے شوز پالش کر کے رکھتی۔ شروع شروع میں انہوں نے اسے ایسا کرنے سے روکا مگر جب وہ برا مان کر ان سے ناراض ہونے لگی تو انہیں خاموشی اختیار کرنی پڑی۔

شاہدہ آنٹی کی صحبت میں وہ کافی کچھ پکانا تو سیکھ ہی گئی تھی۔ اس لیے اب علی کے لیے لنچ باکس وہی تیار کرتی۔ خود پاپا کو اب صرف اسی کے ہاتھ کی چائے پسند آتی تھی۔ اس کی زندگی کا محور اور مقصد بس پاپا اور علی تھے۔ ان دونوں کو کبھی کوئی دکھ نہ پہنچے۔ بس وہ دونوں خوش رہیں۔ وہ ہر لمحے یہی دعا کرتی۔

انٹر سائنس پری میڈیکل گروپ سے کر کے فارغ ہوئی تو آگے وہ کون سی فیلڈ اختیار کرتی ہے۔ فیصلہ پاپا نے کلی طور پر اس پر چھوڑ دیا۔ وہ پڑھائی معاملے میں زور زبردستی کے قائل نہ تھے۔ اس

نے بہت محنت کی تھی اسے یاد تھا کہ ممی اسے ڈاکٹر بنانا چاہتی تھیں۔ اس کی انٹر میں بہت اچھی پرسنٹیج تھی تو وہ ممی کی خواہش کو عملی روپ دے کر پوری کرتی۔ پاپا نے اس کا فیصلہ سنا تو انہیں بھی بہت خوشی ہوئی اور اس کا ایڈمیشن ڈی ایم سی میں ہو گیا۔ علی ان دنوں سکستھ اسٹینڈرڈ میں تھا۔ میڈیکل کی ٹف پڑھائی بالکل بھی مشکل نہیں لگ رہی تھی۔ گھر میں اس کی انتہائی ... پاپا موجود تھے۔ اس کے اسائنمنٹ اور نوٹس ساری کلاس میں بہترین ہوتے تھے۔ پاپا پڑھائی میں اس کو بہت گائیڈ کرتے تھے۔ ان دونوں نے پڑھائی کے معاملے میں پاپا کو ہرگز بھی مایوس نہیں کیا تھا۔ علی نے او لیول کا امتحان شاندار نمبروں سے پاس کیا تھا۔ تمام مضامین میں اس کا اے گریڈ تھا۔ پھر اے لیول میں بھی اس نے تمام مضامین میں اے گریڈ حاصل کر کے پاپا کا سر فخر سے بلند کرا دیا۔ اے لیول میں تمام مضامین میں اے گریڈ حاصل کرنا مذاق نہ تھا۔ خود تابندہ کا یہ حال تھا جیسے یہ کامیابی خود اسی کی ہے۔ وہ ان دنوں پاؤں زمین پر نہیں رکھ رہی تھی۔ تابندہ کی طرح پاپا نے علی کو بھی مکمل آزادی دی تھی کہ وہ آگے جو کچھ پڑھنا چاہتا ہے پڑھے۔ اس نے اپنے لیے آرکیٹیکٹ کی فیلڈ کا انتخاب کیا تھا۔ تابندہ کی ہاؤس جاب مکمل ہوئی تو اس نے پاپا کا ہاسپٹل جوائن کر لیا تھا۔

وہ بہت خوبصورت تھی، ذہین تھی، لکھی پڑھی تھی اور پھر ویل آف فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ چنانچہ میڈیکل کی پڑھائی کے دوران ہی کئی اچھے گھرانوں سے اس کے لیے رشتے آنا شروع ہو گئے تھے مگر ان کے بارے میں کبھی پاپا نے سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پہلے تابندہ اپنی پڑھائی مکمل کر لے پھر شادی کریں گے۔ خاندان میں بھی کئی لوگوں نے ان سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ خود ان کی بہن نرگس اور تابندہ کی خالہ ثمو نے بھی اپنے بیٹوں کے لیے تابندہ کا ہاتھ مانگا تھا۔ اب وقت آگیا تھا کہ وہ ... کی کے ساتھ اس موضوع پر سوچیں۔ ان کا زیادہ جھکاؤ خاندان میں کرنے کی طرف تھا مگر وہ بیٹی کی رائے اور اس کی پسند ناپسند کو ہر حال میں مقدم سمجھتے تھے۔

نرگس شکاگو میں رہتی تھیں اور ان کے بیٹے نے ایم بی اے کیا ہوا تھا اور وہیں ایک فرم میں ملازم تھا جبکہ ثمو کے بیٹے نے کمپیوٹر انجینئرنگ کیا ہوا تھا اور ایک ملٹی نیشنل میں جاب کر رہا تھا۔ ثمو کی فیملی لاہور میں سیٹل تھی۔ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے لیے ہامی بھرنا چاہتے تھے۔ اگر اس کی ممی زندہ ہوتیں تو وہی اس سے اس بارے میں بات کرتیں۔ ان کی کمی اس موقع پر شعیب کو بہت محسوس ہوئی تھی۔ آخر کار انہوں نے خود ہی اس سے بات کی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی بیٹی اتنی فرمانبردار اور سعادت مند ہے کہ یہ فیصلہ ان کی مرضی پر چھوڑ دے گی اور ان کی رضا کے آگے سر جھکا دے گی مگر اس مقام پر وہ اتنی مختلف ثابت ہوئی کہ وہ حیران رہ گئے۔

اس نے دونوں پروپوزلز ریجیکٹ کر دیے تھے۔ ان کے زیادہ اصرار اور اس بات پر کہ کیا وہ کسی کو پسند کرتی ہے یا کہیں اور شادی کرنا چاہتی ہے اس نے انکار میں گردن ہلا کر یہ کہا تھا کہ وہ پاپا اور علی کو چھوڑ کر کراچی سے باہر کہیں نہیں جائے گی۔ نہ شکاگو اور نہ ہی لاہور۔ پاپا نے ہر جتن کر لیا۔ کتنی ساری مثالیں دیں۔ اسے اس کی ممی کا بتایا کہ وہ اسلام آباد میں اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر ان کے ساتھ کراچی آگئی تھیں۔ انہوں نے اسے سمجھایا تھا کہ شادی کے بعد ہر لڑکی کو اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو چھوڑنا پڑتا ہے مگر وہ ان کی کسی بھی دلیل سے قائل نہ ہوئی تھی۔ اس کے پاس آخری ہتھیار آنسو تھے سو وہ آنسو بہانے بیٹھ گئی۔ اور ہمیشہ کی طرح پاپا اس کے آنسوؤں سے ہار گئے تھے۔ نرگس اور ثمو دونوں ہی کو انکار کر دیا گیا۔ ثمو نے تو پھر بھی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا اور اس بات پر خفا نہیں ہوئیں مگر نرگس نے اس انکار کو اپنی توہین سمجھا اور بھائی سے خوب لڑ جھگڑ کر تمام تعلقات منقطع کر لیے۔

علی اس سارے قصے میں خاموش تماشائی بنا رہا

تھا۔ اس طرح تو اس نے اس سے پہلے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی ماں جیسی بہن کبھی اسے چھوڑ کر بھی چلی جائے گی۔ اپنی سگی ماں کو تو اس نے صرف تصویروں اور مووِیز میں ہی دیکھا تھا مگر ماں کی مامتا کیا ہوتی ہے اور ماں کی گود میں کیسی گرمی، تحفظ اور اطمینان ملتا ہے یہ سب تو اس نے تابیہ ہی سے پایا تھا۔ جتنی شدت سے تابیہ ممی کو یاد کرتی تھی علی نے کبھی بھی نہیں کیا تھا۔ اس کی ماں تو اس کے پاس تھی۔ وقتی طور پر اس کی شادی کا ایشو دب گیا تھا کہ خاندان میں انکار کر کے فوراً ہی خاندان سے باہر کہیں رشتہ طے کر کے وہ سب لوگوں کو مزید ناراض نہیں کر سکتے تھے۔ اس قصے سے نجات ملنے پر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔

مگر اس نے یہ ضرور سوچا تھا کہ اس بار تو پاپا نے اس کی ضد مان لی ہے کیا آئندہ بھی وہ اس کی بات مان لیں گے؟ وہ پاپا کو کیسے بتائے کہ اسے شادی کرنی ہی نہیں ہے۔ آج نہ کل۔ وہ ہمیشہ پاپا اور علی کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ ان لوگوں کی زندگی میں کسی تیسرے فرد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ کیسے پاپا اور علی کو چھوڑ کر جا سکتی تھی۔ اس کے بعد پاپا کا کیا ہوگا۔ وہ تو اپنی صحت کے معاملے میں اتنی لاپروائی برتتے ہیں۔ اپنے مریضوں کے چکر میں لگ کر انہیں اپنی صحت کا اور اپنی ڈائٹ کا بالکل بھی خیال نہیں رہتا اور علی وہ تو پڑھائی کی دھن میں کھانا پینا تک بھول جاتا ہے۔ ابھی تو اس کا آرکیٹیکچر کا پہلا سال ہے۔ ابھی تو اسے بہت آگے جانا ہے۔ میں کیسے اسے چھوڑ کر چلی جاؤں۔ اس کا بس چلتا تو اپنے گھر کسی کو رشتے کے لیے آنے ہی نہیں دیتی کہ نہ کوئی آئے اور نہ ہی اسے پاپا کے سامنے انکار کرنا پڑے۔

دن یونہی پرسکون انداز میں گزر رہے تھے کہ اس سکون کو درہم برہم کرنے کے لیے عاصم شیرازی کی والدہ ان کے گھر چلی آئیں۔ عاصم ڈی ایم سی میں اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس سے دو سال سینئر تھا۔ کالج کے دنوں میں وہ خواہ مخواہ اس کے آگے پیچھے پھرا کرتا تھا۔ کبھی اپنے نوٹس اسے لا کر دے دیتا کبھی اپنے پیپرز اور کبھی کوئی ریفرنس بک۔ تابیہ کی فرینڈز عاصم کے حوالے سے اکثر اسے چھیڑا کرتی تھیں مگر وہ اس چھیڑ چھاڑ کا کوئی نوٹس نہیں لیتی تھی۔ کالج کے زمانے میں تمام ہی لڑکے اس قسم کے افیئرز میں انوالو ہوتے ہی ہیں۔ خود اس نے کبھی بھی عاصم کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی بلکہ زیادہ تر اسے اگنور کیا کرتی تھی۔ اب اس کا پروپوزل آیا تو وہ بوکھلا گئی۔ اتنے سال بعد وہ اچانک دوبارہ اس کی زندگی میں ہلچل مچانے چلا آیا تھا۔ ورنہ کالج سے فارغ ہونے کے بعد تابیہ نے اسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔

پاپا کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ عاصم ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ خود بھی سلجھا ہوا پڑھا لکھا شخص تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید تابیہ نے عاصم ہی کی وجہ سے اس سے پہلے رشتوں کو انکار کرنے کو کہا تھا۔

پاپا نے اس سے پوچھا تو حسب سابق اس نے انکار کر دیا۔ وہ اس کے انکار پر بری طرح پریشان ہو گئے تھے۔ وہ چاہتے تو باپ ہونے کے ناتے اس پر زور دے سکتے تھے اپنا فیصلہ اس کے اوپر مسلط کر سکتے تھے مگر ان کی بیٹی عام لوگوں سے مختلف اور بے حد حساس تھی۔ وہ اس کی مرضی کے خلاف اسے کسی کام کے لیے مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ تابیہ کا مختلف ہونا اس سے پہلے ان کے لیے اتنا باعث تکلیف کبھی نہیں تھا۔ ہر لڑکی کے لیے شادی کی ایک مخصوص عمر ہوتی ہے اور وہ عمر گزر جائے تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ تابیہ اپنے گھر کی ہو جائے۔ اس کے ساتھ کی تمام لڑکیوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ خود اس کی تمام فرینڈز بیاہی گئی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کیسے قائل کریں۔ ان دنوں وہ بہت ڈسٹرب رہنے لگے تھے۔

بیٹی کا مستقبل ان کے لیے سوالیہ نشان بنتا جا رہا تھا۔ وہ اسے کوئی دکھ نہیں دینا چاہتے تھے وہ آبگینے

سی نازک تھی وہ اس کے احساسات کو مجروح نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر خود کو فکرمند ہونے سے بھی نہیں روک سکتے تھے۔ علی نے پاپا کو اس سے پہلے اتنا فکرمند اور پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ محسوس کر سکتا تھا کہ پاپا تابیہ کی شادی کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں۔ اس سے پاپا کی پریشانی دیکھی نہ گئی تو وہ تابیہ کے پاس چلا گیا۔

"آپی آپ پاپا کی بات مان کیوں نہیں لیتیں؟ عاصم ایک اچھا انسان ہے اور اس کی فیملی بھی اچھی لگ رہی ہے۔" علی کی بات پر اس نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر اسے ایک نظر دیکھا اور لاپروائی سے بولی۔

"تم ابھی بچے ہو اور یہ معاملہ تمہارے بولنے کا ہے بھی نہیں۔ اس لیے کوئی اور بات کرو۔" اس کی بات پر علی نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"I am not a child" آرکیٹیکچر کے تھرڈ ایئر میں ہوں میں اور اتنا تو سمجھ ہی سکتا ہوں کہ آپ کی وجہ سے پاپا بہت پریشان ہیں۔"

"ہاں بھئی اب ہمارا علی بڑا ہو گیا ہے۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔ "تم جتنے بھی بڑے ہو جاؤ میرے لیے تو وہی چھوٹے سے بچے ہی رہو گے جسے میں اپنے ہاتھوں سے نہلاتی تھی اور جو میرے ہاتھ پر سر رکھ کر سویا کرتا تھا۔" اس نے بڑی خوبصورتی سے موضوع ہی بدل دیا تو علی بدمزہ ہو کر وہاں سے کھڑا ہو گیا۔

پھر عاصم کے گھر والوں کو انکار کر دیا گیا اور وہ ایک بار پھر پرسکون ہو گئی۔ یہ بلا ٹلی تو دوبارہ پاپا اور علی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ علی رات گئے تک ڈرائنگ بورڈ پر شیٹ لگائے اور سیٹ اسکوائر سنبھالے ڈرائنگ بنانے میں مصروف ہوتا تو وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے چائے یا کافی بنا کر دیا کرتی۔ وہ بہت جینئس اور ذہین بچہ تھا۔ آرکیٹیکچر کے پہلے سال سے ہی وہ لگاتار فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن لے رہا تھا۔ علی کے دوست کمبائن اسٹڈی کے لیے اس کے ساتھ آتے تو ان سب کا بھی ماں کی طرح خیال رکھتی۔ علی کے تمام دوستوں کی وہ آپی تھی۔ وہ ان سب سے ایسے ملتی جیسے ان سے بیس پچیس سال بڑی ہو۔ ان لوگوں کے پاس بیٹھ کر انہیں آرٹسٹک انداز میں ڈرائنگ بناتا دیکھتی اور کبھی کبھار اپنے مشوروں سے بھی نوازا کرتی۔

علی کو مغل آرکیٹیکچر پر آٹو کیڈ ——— پر ڈرائنگ بنانے کا پروجیکٹ ملا تو اس نے تابیہ کے مشورے پر مغل آرکیٹیکچر میں سے تاج محل کا انتخاب کیا۔ اس کے باقی کلاس فیلوز نے نسبتاً آسان عمارتوں کا انتخاب کیا تھا اور اسے بھی اس مصیبت میں پھنسنے سے روکا تھا۔ مگر اس نے دوستوں کے مشوروں کو خاطر میں لائے بغیر پاپا سے انڈیا جانے کی بات کی تھی۔ ہر سال ہی وہ تابیہ اور پاپا کہیں نہ کہیں گھومنے پھرنے ضرور جایا کرتے تھے۔

اس بار علی کے پروجیکٹ کی وجہ سے وہ لوگ انڈیا آ گئے۔ ظاہر ہے اس کا بنیادی انٹرسٹ تاج محل میں تھا سو وہ لوگ آگرہ چلے آئے۔ پاپا تو کسی ٹورسٹ کی طرح گھومنے پھرنے میں مصروف تھے مگر وہ علی کی بھرپور مدد کروا رہی تھی۔ وہ ہر ہر زاویے سے تاج محل کی تصویریں کھینچ رہا تھا۔ اس نے اپنے ویڈیو کیمرے سے تاج محل کی مووی بھی بنالی تاکہ کراچی جا کر اسے ڈرائنگ بناتے ہوئے کوئی دقت نہ ہو۔ تابیہ اسے مختلف مشوروں سے نوازتی رہتی کہ یہاں سے بھی تصویر لو، خالی دروازے کا کلوز اپ لو، وہاں دیوار کے قریب سے ایکسپوز کرو۔ وہ وہاں ایک دو آرکیٹیکچر سے بھی ملا تھا اور ان سے تاج محل کے بارے میں ضروری معلومات اکٹھی کی تھیں۔ پاپا ان دونوں کی دیوانگی پر ہنسا کرتے تھے اور اسے چھیڑتے کہ

"ڈاکٹر صاحبہ! نیم حکیم خطرہ جان ہوتا ہے۔ تم ڈاکٹری ہی ٹھیک ہو آرکیٹیکچر میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔" وہ مسکرا دیتی۔ وہاں سے واپس آ کر علی نے اللہ کا نام لے کر اپنا کام شروع کیا۔

اپنے اس پروجیکٹ کے لیے اس نے دن رات محنت کی۔ سارا سارا دن کمپیوٹر پر بیٹھا ڈرائنگ بناتا

رہتا اور اس محنت کا اسے پورا پورا صلہ بھی مل گیا تھا۔ اس کے کام کو سب ہی نے بہت سراہا تھا۔ اس کے دوست، اساتذہ ہر کوئی اسے سراہ رہا تھا۔

اس کے کام کی پورے کالج میں دھوم مچ گئی تھی۔ اس کے تمام اساتذہ نے اسے مستقبل کا ایک ذہین اور قابل آرکیٹیکچر قرار دیا تھا اور ہمیشہ کی طرح اس کی کامیابی تابندہ کو اپنی کامیابی محسوس ہوئی تھی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے علی کی سلامتی اور حفاظت کے لئے دعا مانگا کرتی۔ وہ اگر بیمار ہو جاتا تو اسے لگتا کہ شاید علی کو نظر لگ گئی ہے۔ وہ تھا بھی تو اتنا پیارا۔ وہ بالکل پاپا کی جوانی تھا۔ انہیں کی طرح ہینڈسم اور اسمارٹ۔ علی گھر سے کالج کے لئے گیا ہیں اور جانے کے لئے نکلنے لگتا تو وہ بالکل ماؤں والے انداز میں دور سے بیٹھے بیٹھے اس پر دعا میں پڑھ کر پھونکا کرتی۔ اس کی ان باتوں پر علی اس کا خوب ریکارڈ لگاتا مگر وہ بالکل بھی پروا نہیں کرتی تھی۔

فائنل ایئر میں اپنے تھیسس کے سلسلے میں کچھ گائیڈنس اور ریفرنس حاصل کرنے کے لئے علی کا ایک پرائیویٹ فرم میں جانا ہوا۔ وہ ایک آرکیٹیکچرل کنسلٹنسی تھی جس میں سول انجینئرز، آرکیٹیکچر اور پلانرز وغیرہ کام کرتے تھے۔ علی کا وہاں کافی زیادہ آنا جانا ہوا اور جانے کیوں وہاں کے آنر مرتضٰی ہاشمی کو اس میں ایسی کیا خاص بات نظر آئی کہ انہوں نے اسے اپنے ہاں جاب آفر کر دی۔ دوران تعلیم ہی جاب وہ بھی اتنی اچھی فرم میں۔ علی تو خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ پھر بھی اس نے پاپا سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ اس کے استفسار پر پاپا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"Go ahead young man" اور یوں اس نے مرتضٰی ہاشمی کی فرم جوائن کر لی تھی۔ وہاں جوائن کرنے سے علی کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا بہترین موقع ملا تھا۔ ابھی تک تو وہ صرف طالب علم تھا اب عملی میدان میں کام کر کے وہ خود کو بہت پراعتماد محسوس کر رہا تھا۔ وہیں جاب کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا تھیسس مکمل ہوا تھا۔ اسے مرتضٰی ہاشمی کے ہاں کام کرتے سات آٹھ ماہ ہو گئے تھے۔

پیپرز کے ختم ہوتے ہی اس کا فائنل ایئر کا رزلٹ نکلا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس نے اس بار بھی میدان مار لیا تھا۔ آرکیٹیکچر کی ڈگری وہ بھی فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن اور گولڈ میڈل کے ساتھ۔ تابندہ کے تو قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اپنی کامیابی کی خوشی میں اس نے آج اپنے دوستوں کو ٹریٹ دی تھی جس میں دیر سے واپس آنے کا وہ بتا کر گیا تھا مگر تابندہ اپنی عادت سے مجبور اس کے انتظار میں جاگتی رہی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

مرتضٰی نے علی کی صلاحیتوں پر بھروسہ کرتے ہوئے ایک پروجیکٹ اس کے حوالے کیا جو اسے انفرادی کرنا تھا۔ مرتضٰی کی اس پروجیکٹ میں شرکت صرف ایک ایڈوائزر کی حد تک تھی۔ علی ان دنوں بہت خوش بلکہ پرجوش تھا۔ خود کو ان تمام صلاحیتوں کا اہل ثابت کرنے کے خیال سے جو مرتضٰی نے اس میں دیکھیں وہ دن رات ایک کر کے محنت کر رہا تھا۔ ان دنوں علی کی زبان پر یا تو اپنے پروجیکٹ کے قصے ہوتے یا مرتضٰی ہاشمی کے بارے میں کوئی بات۔

اس شام وہ گھر پر اکیلی تھی۔ پاپا کا فون آیا تھا کہ وہ کچھ دیر سے آئیں گے اور علی ابھی تک آفس سے گھر نہیں آیا تھا۔ وہ اکیلی سخت بور ہو رہی تھی۔ علی کے اوپر بھی بہت غصہ آ رہا تھا جو ان دنوں کچھ زیادہ ہی مصروف رہنے لگا تھا۔ اسی وقت علی کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو اس نے شکر ادا کیا۔ مگر اب وہ اس کی خبر لینے کا پلان بناتے ہوئے ایک جھٹکے سے لان سے تیز قدموں سے چلتی پورٹیکو کی طرف آگئی۔ علی کی گاڑی کے پیچھے ایک اور گاڑی بھی اندر داخل ہوئی۔ وہ حیران نظروں سے اس دوسری گاڑی کو دیکھنے لگی جبکہ علی اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر اترتا جلدی سے پیچھے والی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا جس میں سے ایک انتہائی شخصیت برآمد ہوئی تھی۔ بلیک پینٹ، وائٹ شرٹ اور ریڈ اور بلیک ٹائی میں ملبوس اس

نے اپنے ایک ہاتھ میں بڑی لاپروائی سے کوٹ ڈالا ہوا تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں موبائل پکڑا ہوا تھا۔

علی اس سے کچھ بات کر کے اس طرف گھوما تو نظریں سیدھی تابندہ پر پڑی تھیں۔ وہ مسکراتا ہوا اس کے پاس آگیا۔ وہ شخص بھی علی کے ساتھ چلتا ادھر ہی آگیا تھا۔

"یہ میری بڑی بہن ہیں تابندہ۔" علی نے مرتضٰی کی طرف دیکھتے ہوئے تعارف کرایا اور پھر اس سے مخاطب ہوا۔

"بجی! یہ مرتضٰی ہاشمی ہیں۔" تابندہ نے ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے مسکرا کر سلام کیا تو وہ رواداری سے مسکراتا جواب دے کر رسمی انداز میں کہنے لگا۔

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" اس نے بھی اسی قسم کے الفاظ استعمال کئے۔ تعارف کی رسم انجام پذیر ہوئی تو علی اس سے بولا۔

"بجی! میں اور مرتضٰی اسٹڈی میں کچھ ضروری کام کریں گے۔ آپ وہیں ہم لوگوں کے لئے چائے بھجوا دیجئے گا۔" پھر علی اور مرتضٰی اسٹڈی میں بند ہو گئے اور وہ کچن میں آکر چائے کے لئے لوازمات ٹرالی سجانے لگی۔ وہ تو عام مہمانوں کے ساتھ بھی بڑی اچھی میزبان ثابت ہوتی تھی۔ جبکہ یہاں تو علی کے باس تشریف لائے تھے۔

اپنے کسی جونیئر کولیگ کے گھر آجانا یقیناً کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس نے ٹرالی اچھی طرح بھر کر کریم بابا کے ہاتھ بھجوا دی۔ وہ بے چارے بہت ضعیف ہو گئے تھے اس لئے تابندہ اب ان سے صرف اوپر کے کام کروایا کرتی تھی۔ کھانا وغیرہ وہ خود ہی پکاتی۔

علی کی واپسی سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ وہ تو ابھی بھی اکیلی بور ہو رہی تھی۔ آٹھ بجے پاپا آگئے تو اس کی بوریت کا خاتمہ ہوا۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ ساڑھے تین گھنٹوں سے اسٹڈی میں بند وہ دونوں جانے نہیں کون سا معمہ حل کر رہے تھے۔ پاپا نے اس سے کھانا لگانے کے لئے کہا اور خود اٹھ کر اسٹڈی

میں چلے گئے۔ "ان لوگوں کو کھانے کے لئے بلانے چلے گئے تو وہ جلدی جلدی کھانا لگانے لگی۔ علی کھانے پینے کا بہت شوقین تھا اس لئے ان کے ہاں کھانے کی میز پر ہمیشہ ہی انواع و اقسام کی ڈشز پائی جاتی تھیں۔ اس لئے وہ ہرگز پریشان نہ تھی کہ مہمان کی خاطر کس طرح کرے۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ دونوں پاپا کے ساتھ باہر آتے نظر آئے۔ تابندہ ڈائننگ ٹیبل کے پاس کھڑی ان لوگوں کا انتظار کر رہی تھی۔ پاپا شاید اسے زبردستی اصرار کر کے کھانے کے لئے روک رہے تھے اور وہ انکار کر رہا تھا۔ آخر کار جیت پاپا ہی کی ہوئی تھی اور وہ ان دونوں کے ساتھ چلتا ڈائننگ ٹیبل کے پاس آگیا تھا۔

کھانے کی میز پر پاپا اور علی اسے مختلف ڈشز آفر کر رہے تھے۔ پاپا اسے شامی کباب کی ڈش پکڑا رہے تھے تو علی بریانی کی ڈش اس کے سامنے رکھتا ہوا کہہ رہا تھا۔ "اتنی مزے دار بریانی آپ نے اس سے پہلے بھی نہیں کھائی ہوگی۔ بجی سے زیادہ اچھی بریانی کوئی اور نہیں پکا سکتا۔" اس نے خاموشی سے بریانی کی ڈش لے لی تھی اور تھوڑے سے چاول اپنی پلیٹ میں ڈال لئے تھے۔ پاپا کے اصرار پر شامی کباب بھی پلیٹ میں رکھ لیا تھا۔

وہ خود خاموشی سے کھانا کھا رہی تھی۔ انجان لوگوں سے ایک دم بے تکلف ہو جانا اس کی فطرت میں شامل ہی نہیں تھا۔ کھانے کے بعد وہ تینوں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے اور تابندہ سب کے لئے کافی بنانے کچن میں آگئی۔ ٹرے اٹھائے وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو اندر بڑے خوشگوار ماحول میں گفتگو جاری تھی۔ وہ پاپا کی کسی بات کا جواب دے رہا تھا۔ تابندہ اس کی بات کے ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی کہ۔

بات ختم کرے تو وہ اس سے چینی کا پوچھے۔ اپنی بات ایک لمحے کے لئے روک کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا اور بولا "ڈیڑھ چمچ" اور دوبارہ سے اپنی گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑ دیا جہاں سے توڑا تھا۔ کیا اس کی وہ

"کے بجائے چار آنکھیں ہیں۔" تانیہ نے سوچا تھا۔ بظاہر پاپا کی طرف متوجہ ہونے کے باوجود اس نے اسے کس طرح دیکھ لیا تھا۔ وہ حیران ہوتی کپ میں چینی ملا کر اس کے پاس کپ لے آئی جسے اس نے شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔ پاپا اور علی کو بھی کافی دے کر وہ خود بھی اخلاق نبھانے کی خاطر وہیں بیٹھ گئی۔ علی پاپا سے کہہ رہا تھا۔

"یہ تو ابھی نہیں رہے تھے میں زبردستی لایا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں نے کمپیوٹر پر اپنے پروجیکٹ کا کچھ کام کیا ہے۔ جس پر میں ان کی رائے لینا چاہتا ہوں تو کہنے لگے کہ فلاں پر کاپی کر کے لے آؤ میں یہاں دیکھ لوں گا مگر میں اڑ گیا کہ آپ کو ضرور میرے ساتھ چلنا ہے اور وہیں جا کر میرا کام دیکھنا ہے۔" علی کی باتوں پر وہ خاموشی سے مسکراتا ہوا کافی کے سپ لے رہا تھا۔

اس کی اس بات پر پاپا نے مرتضیٰ سے کہا تھا۔

"یہ تو علی نے بہت اچھا کیا کہ آپ کو لے آیا۔ میں خود بھی آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ علی کے منہ سے صبح شام آپ کا نام سن سن کر مجھے آپ سے ملنے کا اچھا خاصا شوق ہو گیا تھا۔" پاپا کی بات پر وہ ایک دم بولا تھا۔

"میرے آنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ علی آپ کا ذکر اتنا کرتا ہے کہ میں سخت قسم کے شوق میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اتنے ذہین اور قابل شخص سے اب تک میں کیوں نہیں ملا۔"

"اس جوابی تعریف کا بے حد شکریہ۔" پاپا نے زندہ دلی سے قہقہہ لگایا تو وہ بھی ہنس پڑا تھا۔ کافی تھی سب لیکن وہ خاموشی سے ان لوگوں کی باتیں سن رہی تھی جو پاپا سے کہہ رہا تھا۔

"علی میں مجھے بائیس تئیس سالہ مرتضیٰ کی جھلک نظر آئی تھی اسی لیے جب یہ میرے پاس آیا تو میں نے اسے جاب آفر کی تھی۔ اس کی عمر میں میں بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ اتنا ہی کمیٹڈ اور ڈائنامک۔ اس میں بہت صلاحیتیں ہیں۔ یہ زندگی میں بہت آگے جائے گا۔ اس کے اندر پوٹینشل ہے، ٹیلنٹ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ بہت محنتی ہے۔ اپنے دوستوں میں بہت قدر کرتا ہوں۔ میں نے اپنی فرم میں سب ینگ اور فریش لوگ رکھے ہیں۔ اگر ہر کوئی تجربہ کار کی ڈیمانڈ کرے گا تو فریش لوگ کیا کریں گے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جتنے قابل اور محنتی فریش گریجویٹس ہوتے ہیں اتنا کوئی تجربہ کار تو نہیں ہو سکتا۔ نئے ذہن کو نکلتے ہیں۔ نئے آئیڈیاز ذہن میں ہوتے ہیں۔ سوچ اور زیادہ اڑان والی۔ میرا یہ تجربہ ابھی تک کامیاب رہا ہے۔" وہ اس کے علی کی تعریفیں کر رہا تھا۔

تانیہ کو اچانک ہی اس بندے میں بہت زیادہ دلچسپی محسوس ہوئی۔ وہ جو اتنی دیر سے بیٹھی لاپروائی سے یہاں وہاں نظریں دوڑا رہی تھی اب اس پر نظریں جمائے بغور اسے بولتا سن رہی تھی۔ اسے وہ ایک دم بہت اچھا لگنے لگا تھا۔ پاپا نے اس کے خیالات کو سراہا تھا انہیں بھی وہ یقیناً بہت اچھا لگا تھا ورنہ وہ کسی سے اتنی بے تکلفی سے بات نہیں کیا کرتے تھے۔ علی اور مرتضیٰ اپنے پروفیشن کے حوالے سے باتیں کر رہے تھے۔

"پری آپ بھی تو کچھ بولیں۔" علی اچانک اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ علی کی بات پر مرتضیٰ نے بھی ایک لمحے کو اس کی طرف دیکھا تھا۔

"میں آپ لوگوں کو سن رہی ہوں۔" وہ علی سے بولی تو اس پر سے نظریں ہٹا کر مرتضیٰ سے کہنے لگا۔

"پتا ہے مرتضیٰ بھائی پری نے بھی پاپا کی طرح میڈیسن پڑھی ہے۔" مرتضیٰ نے ایک نظر علی کو دیکھا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"پھر تو آپ انکل ہی کے ہاسپٹل میں جاب کر رہی ہوں گی۔" جواب میں اس نے گردن ہلا دی تھی۔ مزید پانچ دس منٹ بیٹھ کر مرتضیٰ ان لوگوں سے اجازت طلب کرتا جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ پاپا اور علی اسے باہر تک چھوڑنے گئے۔

کافی کے کپ کچن میں رکھ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی اور وضو کرنے کے لیے باتھ روم میں گھس گئی۔ وضو کر کے وہ نماز کے لیے دوپٹہ اوڑھ رہی تھی کہ علی

آ گیا اور اس سے بولا۔

"پری آپ کو مرتضیٰ کیسے لگے؟"

"بہت اچھے لگے جیسی تم ان کی تعریفیں کیا کرتے تھے۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں اور یقیناً" وہ بہت Perspicacious بھی ہیں تبھی تو انہوں نے ہمارے اندر چھپے ہوئے ٹیلنٹ کو کھوج نکالا۔" ابھی پہلے ہی علی اس سے اس بندے کے بارے میں اس کی رائے جاننے کا متمنی تھا اس لیے بڑی سچائی سے اس کی تعریف کر رہی تھی۔ اس کے جواب نے علی کو بہت خوش کر دیا تھا وہ مسکراتا ہوا صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"میں تو مرتضیٰ کو آئیڈیلائز کرتا ہوں۔ وہ اپنے پروفیشن سے عشق کرتے ہیں۔ میں بالکل ان جیسا بننا چاہتا ہوں۔ انہوں نے بھی ہمارے کالج ہی سے گریجویشن کی تھی پھر وہیں سے ماسٹرز کیا ہے۔" "اچھا ہاں۔" "جی۔ اس کے بعد وہ مزید پڑھائی کے لیے امریکا چلے گئے۔ وہاں پڑھائی کے دوران ہی انہیں اتنی اچھی اچھی جگہوں سے جاب آفر ہوئیں مگر وہ ان سب کو ٹھکرا کر پاکستان واپس آ گئے۔ وہ صرف حب الوطنی کا راگ نہیں الاپتے لیکن اپنے عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ انہیں اپنے ملک سے محبت ہے۔ یہاں آ کر انہوں نے اپنی فرم کا آغاز کیا اور صرف پانچ چھ سال میں ہی ان کی فرم کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔" علی کو باتوں کے موڈ میں دیکھ کر وہ بھی بیڈ پر بیٹھ گئی اور مسکراتے ہوئے "مرتضیٰ نامہ" سن رہی تھی۔

"ان کی فرم تو میں نے صرف ایکسپیرینس کے لیے جوائن کی ہے میرا ارادہ تو اپنی ذاتی کنسلٹینسی کھولنے کا ہے۔" وہ اپنے مستقبل کے ارادوں کا اظہار کر رہا تھا۔

"لیکن اس سے پہلے تمہیں ماسٹرز کر لینا چاہیے۔" تانیہ نے اپنی رائے ظاہر کی تو وہ سر ہلاتا ہوا بولا۔

"ہاں ایک دو سال مرتضیٰ کی فرم میں کام کرنے کے بعد میں پہلے ماسٹرز کرنے اسٹیٹس جاؤں گا اس کے بعد اپنی فرم اسٹیبلش کروں گا۔" اپنی بات ختم کر کے اچانک وہ مسکراتا ہوا کہنے لگا۔

"وہاں سب لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مرتضیٰ پر ایسا کیا جادو کر دیا ہے جو وہ تمہارا اتنا Admirer بن گیا ہے۔ وہ تو اچھے اچھوں کے کام میں عیب نکالتا ہے لیکن وہ مجھے بہت امپورٹینس دیتے ہیں۔ میرے مشوروں کو بہت دھیان سے سنتے ہیں اور میرے سینئر کولیگز پروفیشنل جیلسی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔"

علی کی باتیں وہ بڑے غور سے سن رہی تھی۔ اسے اپنے ذہین اور قابل بھائی پر فخر ہو رہا تھا اور وہ شخص بھی بہت اچھا لگ رہا تھا جو اسے اہمیت دے رہا تھا۔ یقیناً وہ خود بہت غیر معمولی ذہانت کا حامل شخص ہو گا جس نے علی کے اندر چھپے ہنر کو تلاش کر لیا تھا۔

علی نے اپنا پہلا پروجیکٹ کامیابی کے ساتھ مکمل کر لیا تھا۔ آج کل وہ "مکرم بلڈرز" کے لیے فلیٹ اور شاپنگ مال کی ڈرافٹنگ میں مرتضیٰ کی معاونت کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ دو اور آرکیٹیکٹ بھی اس پروجیکٹ میں مرتضیٰ کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے۔

وہ کچن میں تھی جب فون کی بیل نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ گیلے ہاتھ پونچھتی ہوئی وہ جلدی سے لاؤنج میں آئی اور فون ریسیو کیا۔ اس کے سلام کے جواب میں دوسری طرف سے مرتضیٰ بولا۔

"وعلیکم السلام میں مرتضیٰ بات کر رہا ہوں۔" اپنا نام بتا کر وہ ایک سیکنڈ کے لیے خاموش ہو کر سوچنے لگا کہ علی کی بہن کا نام کیا ہے مگر ذہن پر زور ڈالنے کے باوجود نام یاد نہ آیا تو بولا۔

"آپ علی کی سسٹر بات کر رہی ہیں؟"

"جی۔" وہ اس کے فون کرنے پر حیران ہوتی ہوئی مزید بولی۔ "علی تو ابھی تک آفس سے واپس نہیں آیا۔ کیا وہ آپ کے ساتھ آفس میں موجود نہیں ہے؟" اسے اچانک ہی عجیب عجیب وہم ستانے لگے۔ اپنے اندر ہوتی دھڑ دھڑ کو کنٹرول کرتی وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

"جی وہ میرے ساتھ ہی ہے۔ ہم لوگوں کا آج لیٹ نائٹ آفس میں رک کر کام کرنے کا ارادہ ہے۔ علی کو میں نے کسی کام سے باہر بھیجا ہے اور اسی کے کہنے پر آپ کو میسج دینے کے لئے فون کیا تھا کہ وہ رات میں گھر نہیں آئے گا۔" اس کی بات پر تانیہ کا موڈ بری طرح خراب ہو گیا۔

مرتضیٰ سے تو کچھ کہہ نہیں سکتی تھی اس لئے "اچھا" اور "ٹھیک ہے" کہہ کر فون بند کر دیا مگر دل میں وہ کیا ارادہ کر چکی تھی کہ علی کی طبیعت اچھی طرح صاف کرنی ہے۔ ایسا بھی کیا کام کا جنون کہ بندہ اپنا آرام سکون اور نیند سب قربان کر دے۔ ساری رات جاگتی رہی تھی وہ علی کو دل ہی دل میں خوب برا بھلا کہہ چکی تھی۔ صبح اس نے ہاسپٹل جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور گھر میں رک کر علی کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ بابا علی کی کھنچائی کا سوچ کر ہنستے ہوئے ہاسپٹل چلے گئے تھے۔ دس بجے کے قریب چوکیدار کے گیٹ کھولنے کی آواز سنائی دی تو وہ غصے کے مارے اٹھ کر باہر بھی نہیں گئی اور وہیں لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ کر اپنے غصے کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر آتے مرتضیٰ اور علی کو دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ علی کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالے وہ آہستہ قدموں سے چلتا اسی کی طرف آرہا تھا۔ علی کا لنگڑا کر چلنا اور مرتضیٰ کے سہارے اس نے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ گویا دل کی حرکتوں کو قابو کرنے کی کوشش کی تھی۔

"علی کیا ہوا؟ تم ٹھیک تو ہو ناں۔" وہ ایک دم آگے بڑھ کر علی کی طرف آئی تھی اور اس کے بازو کو اپنی گرفت میں لے کر پریشان نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی تھی۔

"یہ بالکل ٹھیک ہے۔ معمولی سا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ آپ اسے بستر پر لٹنے دیں پھر آرام سے بات کر لیجیے گا۔" اس کے پریشان چہرے پر نظریں جمائے مرتضیٰ نے رسانیت سے کہا تو وہ ایک دم اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آپ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا؟" وہ خفت غصے میں نظر آرہی تھی۔ مرتضیٰ نے گردن ہلا دی تھی اور بولا تھا۔

"میں کیا کرتا۔ علی نے مجھے منع کیا تھا کہ اصل بات مت بتانا میری بہن پریشان ہو جائے گی۔" وہ سنجیدگی سے بولا تو وہ تمام تر مروت اور اخلاق بالائے طاق رکھ کر اس پر الٹ پڑی۔

"آپ کو تو یقیناً بہت خوشی ہو رہی ہے اس کا کیا ہے۔ یہ تو بالکل ہے آپ کو تو کم از کم صحیح بات بتانی چاہیے تھی۔ اگر خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تب۔" آگے کی بات اس سے کہی نہیں گئی کہ آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے تھے۔ اس کے رونے پر وہ دونوں ہی بوکھلا گئے تھے۔

"بجیا! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دیکھیں آپ کے سامنے تو ہوں میں۔ بہت ہی معمولی سی چوٹیں آئی ہیں۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔" علی نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا تو وہ اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر غرائی۔

"بات مت کرو مجھ سے۔" علی نے بے بسی سے ایک نظر اسے اور ایک نظر مرتضیٰ کو دیکھا تو وہ علی سے بولا۔

"علی تمہارا بیڈروم کہاں ہے؟ تو میں تمہیں سہارا دے کر چھوڑ آؤں۔" یقیناً اس رونے دھونے کے مظاہرے میں علی بے چارے پر بڑی گزر رہی تھی۔ اسے آرام کی ضرورت تھی جبکہ بس صاحبہ یہیں کھڑے کھڑے تمام حساب بے باق کرنے کے موڈ میں تھیں۔ علی کی نشاندہی پر وہ اسے لئے آگے بڑھ گیا تو وہ بھی ان دونوں کے پیچھے چلتی علی کے کمرے میں آگئی۔ مرتضیٰ نے بستر پر لٹانے میں اس کی مدد کی۔ علی کے چہرے پر موجود تکلیف کے آثار بتا رہے تھے کہ چلنے پھرنے میں اسے کتنی تکلیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

"ایکسیڈنٹ ہوا کیسے؟" وہ دونوں کی طرف

سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی تو علی اس کی تسلی کی خاطر تفصیل سے بتانے لگا۔

"میں اور مرتضیٰ سائٹ سے واپس آرہے تھے گاڑی میں ہی ڈرائیو کر رہا تھا کہ اچانک سامنے سے ایک اور گاڑی آگئی۔ اور گاڑی سے ٹکرا گئی۔ ہم دونوں پتا نہیں کیسے معجزانہ طور پر بچ گئے۔" وہ علی کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی جبکہ مرتضیٰ سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"آپ خود ڈاکٹر ہیں۔ اچھی طرح چیک کرلیں۔ کوئی فریکچر نہیں ہوا ہے۔ کوئی اور Complication بھی نہیں ہے صرف ہاتھوں اور چہرے پر چوٹ لگی ہے۔ تھوڑا بہت ریسٹ کرے گا تو بالکل ٹھیک ہوجائے گا۔" مرتضیٰ نے علی کی جان چھڑانے کے لئے خود ہی جواب دے دیا۔

بڑا عجیب انداز تھا علی کا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا اگر جو اسے رات فون پر ایکسیڈنٹ کا بتاتا تو پتا نہیں کیا کر گزرتی۔ وہ اس کے ڈاکٹر ہونے پر حیران تھا۔ ایک ڈاکٹر اور اتنے کمزور دل کی مالک۔ اس کے جواب پر تابیہ نے بغور اس کی طرف دیکھا اور فکرمندی سے بولی۔

"آپ تو ٹھیک ہیں ناں۔ آپ کو تو کوئی چوٹ نہیں لگی؟" اس کے بات کرنے کا انداز بالکل ویسا ہی تھا جیسے وہ علی کے دوستوں کے ساتھ اختیار کیا کرتی تھی۔ بڑی اپنائیت والا۔

مرتضیٰ کو آج وہ اس دن سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ وہ اس کی فکرمندی پر مسکراتا ہوا بولا۔

"الحمد للہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ معمولی سی خراشوں کے علاوہ اور کوئی چوٹ نہیں لگی۔" پھر وہ علی سے کہنے لگا۔ "اچھا علی میں چلتا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔" وہ جانے کے لئے کھڑا ہونے لگا تو وہ فوراً اٹھتے ہوئے بولی۔

"آپ بیٹھئے پلیز۔ میں کافی لاتی ہوں۔" اس کی بات پر علی بھی اصرار کرنے لگا۔

"ہاں یار! ان کو ایسے مت جانے دیجئے گا۔ ساری رات یہ میرے ساتھ ہاسپٹل میں خوار ہوتے رہے ہیں۔ کافی شافی نہیں بلکہ بہت اچھا سا ناشتا لائیں۔" وہ ان دونوں کے اصرار پر وہ ہنس پڑا اور بولا۔

"ناشتا بھی کروں گا اور کافی بھی پیوں گا مگر آج نہیں پھر کبھی۔ ابھی مجھے ایک بہت ضروری میٹنگ میں شرکت کرنی ہے اور اس سے پہلے گھر جا کر اپنا حلیہ درست کرنا ہے۔" وہ اپنی سلوٹ زدہ بلیو شرٹ کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ ان دونوں کو خدا حافظ کہتا وہ کمرے سے باہر نکلا تو وہ بھی اسے گیٹ تک چھوڑنے کے لئے اس کے ساتھ ہی باہر آگئی۔

"آپ کا بہت شکریہ۔ آپ نے علی کے لئے اتنی تکلیف اٹھائی میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں۔" اس نے اپنے ساتھ چلتی اس لڑکی کو بڑے غور سے دیکھا جو بڑی سنجیدگی اور تفکر آمیز انداز میں اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"حالانکہ آپ کو تو مجھ سے ناراض ہونا چاہیے کہ میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔" اس کی بات پر تابیہ کو اپنا کچھ دیر پہلے کا رویہ یاد آیا تو وہ کچھ شرمندہ سی ہوگئی۔

"آئم سوری۔ اگر آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہے تو میں اس کے لئے ایکسکیوز کرتی ہوں۔" وہ ایک دم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ تابیہ کو اس کے قہقہے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اسے خدا حافظ کہتا وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔

پورے چھ دن تک اس نے علی کے کہیں بھی آنے جانے پر سخت پابندی لگائے رکھی۔ [illegible] وہ اس کی خدمت میں مصروف رہی۔ اچھی طرح اسے زبردستی فروٹ کھلاتی، دودھ پلاتی اور وہ بے چارہ احتجاج کرتا رہ جاتا۔ اس موقع پر پاپا بھی تابیہ کے حمایتی بن گئے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ خود بھی اسے کھلانے پلانے اور آرام کرانے میں مصروف تھے۔

اس کے تمام دوست گھر پر آکر اس کی عیادت کر گئے تھے۔ خود مرتضیٰ اس دن کے بعد سے دوبارہ نہیں

آیا تھا۔ البتہ اس نے فون پر ایک دو مرتبہ اس کی خیریت پوچھی تھی۔ ساتویں دن کہیں جا کر علی کو بستر چھوڑنے اور آفس جانے کی اجازت ملی تو اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ تابیہ نے اسے آفس جانے کی اجازت صرف اس شرط پر دی تھی کہ وہ آفس ٹائم ختم ہونے کے بعد سیدھا گھر آئے گا اور یہاں کے کاموں میں لگ کر خود کو ہرگز بھی ہلکان نہیں کرے گا۔ علی کے وعدہ کرنے کے باوجود بھی اسے بے اعتباری تھی اس لئے اسے اس کی گاڑی میں آفس جانے دیا بلکہ جب خود ہاسپٹل کے لئے نکل رہی تھی تو پہلے ڈرائیور نے علی کو اس کے آفس چھوڑا اور پھر اسے ہاسپٹل۔ واپسی کے لئے بھی اس نے علی سے یہی کہا کہ ڈرائیور کے ساتھ آکر شام میں اسے پک کرلے گی اور علی کو ناچار اس کی تمام شرائط ماننی پڑ رہی تھیں۔

شام کو ٹھیک پانچ بجے وہ علی کے آفس پہنچ گئی تھی۔ ریسیپشن پر بیٹھی اس گڈ لکنگ لڑکی سے وہ علی کی بابت دریافت کر رہی تھی کہ پیچھے سے مرتضیٰ کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے ساتھ چلتے کسی آدمی کے ساتھ باتیں کرتا ہوا وہاں سے جا رہا تھا۔ باتیں کرتے اچانک اس کی نظر اس پر پڑی تو وہ فوراً رک گیا اور اس کی طرف آتا ہوا بولا۔ "السلام علیکم" اس نے سلام کا جواب دیا تو وہ اس کی یہاں موجودگی پر حیرانی ظاہر کرتا ہوا بولا۔

"آپ یہاں؟ خیریت تو ہے ناں؟"

"جی خیریت ہے۔ مجھے علی سے کچھ کام تھا۔" اس نے علی کو لینے آنے کا بتانے سے پرہیز کیا۔

"علی تو خاور یزدانی صاحب کے ساتھ ان کے گھر کے لئے فرنیچر پسند کرنے گیا ہے۔" مرتضیٰ سے دو تین قدم پیچھے کھڑے اس دوسرے بندے نے علی کی غیر موجودگی کی اطلاع دی تو اس کا موڈ بری طرح آف ہو گیا۔

"اچھا علی ان کے ساتھ گیا ہے ویسے ان کا کام کتنا رہ گیا ہے؟" مرتضیٰ کو اس دن کے بعد سے ایک اور بات یاد آئی تو وہ اس کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"علی تو پریشان ہو گیا ہے۔ خاور صاحب کی پسند ہی اتنی مشکل ہے۔ ان کے گھر کا انٹیریئر بڑا ہی مشکل ثابت ہو رہا ہے بے چارے کے لئے۔" اس دوسرے بندے نے ہنستے ہوئے بتایا تھا۔ تابیہ ان دونوں کی باتیں خاموشی سے سن رہی تھی۔

"علی ابھی تھوڑی دیر میں آجائے گا۔ آپ آیئے پلیز۔" مرتضیٰ نے کہا۔ اسے اپنے کمرے میں چلنے کی آفر کی تو وہ انکار کرتے کرتے رہ گئی۔ اب یہاں تک آگئی تھی تو اس طرح چلے جانا اسے بدتمیزی محسوس ہوا۔ اس نے قدم بڑھائے تو مرتضیٰ جو اس کے انتظار میں کھڑا تھا وہ بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ دوسرا بندہ کسی اور کمرے میں گھس گیا تھا۔ اس کا پورا آفس ہی بہت شاندار تھا۔ وہاں کا انٹیریئر زبردست تھا اور اگر یہاں کا انٹیریئر اچھا نہیں ہوتا تو پھر کہاں کا ہوتا۔ آخر یہ ایک آرکیٹیکچرل فرم تھی۔ اگر یہاں کا انٹیریئر اچھا نہیں ہوگا تو کلائنٹس تو پہلی دفعہ کے بعد دوبارہ بھی آئیں گے ہی نہیں۔ وہ وہاں کی سجاوٹ کو سراہتی اس کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوئی تو داد دیئے بغیر نہ رہ سکی۔

کمرے میں موجود فرنیچر، ان ڈور پلانٹس، پردے یہاں تک کہ ٹیبل پر رکھا کیلنڈر بھی سب کچھ اتنی مناسبت سے اور اچھی طرح رکھا ہوا تھا کہ دیکھنے والے کو بھی پتا چل جائے کہ یہ چیف ایگزیکٹو اور منیجنگ ڈائریکٹر کا کمرہ ہے۔ اسے بیٹھنے کی آفر کرتا وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور بولا۔

"میرے آفس کا سارا انٹیریئر میں نے خود کیا ہے۔ یہاں تک کہ سارا فرنیچر بھی میں نے ہی ڈیزائن کیا ہے۔" وہ اس کے منہ سے یہ بات سن کر دھک سے رہ گئی۔ کیا اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ وہاں کے انٹیریئر کے بارے میں سوچ رہی ہے یا وہ یونہی بات برائے بات کے لئے یہ بات کہہ گیا تھا۔ تابیہ نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی تو وہ بھرپور مسکراہٹ چہرے پر سجائے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک بہت ہی

ذہین شخص تھا اور اسے اپنے تاثرات دوسروں سے چھپانے بھی آتے تھے۔ اس لیے تابیہ اس کی طرف دیکھنے کے باوجود بھی کوئی اندازہ نہیں لگا پائی۔

"کیا لیں گی آپ؟ چائے، کافی یا کولڈ ڈرنک؟" وہ انٹرکام اٹھائے اس سے پوچھنے لگا تو اس نے فوراً ہی کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔ آپ پلیز تکلف مت کریں۔" وہ یہاں چائے کافی پینے تو نہیں آئی تھی۔ اسے علی کی بدتمیزی پر سخت غصہ آرہا تھا۔

"پھر بھی کچھ تو۔ آخر آپ پہلی مرتبہ ہمارے آفس آئی ہیں۔" اس نے دوبارہ اصرار کیا تو اس نے مجبوراً چائے کے لیے کہہ دیا۔ وہ انٹرکام پر چائے لانے کے لیے کہہ کر فارغ ہوا تو اس کی فون کال آگئی۔ وہ فون پر شاید اپنے کسی کلائنٹ سے بات کر رہا تھا اور تابیہ اس کی میز کے پیچھے بڑی خوبصورتی سے رکھے مختلف بلڈنگز کے ماڈل دیکھنے لگی تھی۔

مرتضیٰ نے باتیں کرتے کرتے ہوئے غور سے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو کاٹن کے سادہ سے سوٹ میں ملبوس کسی بھی غیر ضروری آرائش اور سجاوٹ کے بغیر تھی۔ اس کے چہرے پر میک اپ کے نام پر شاید صرف لپ اسٹک ہی لگی ہوئی تھی۔ اپنے کمر تک آتے لائٹ براؤن بالوں کی سیدھی مانگ کے ساتھ چوٹی باندھے وہ آج کل کی لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔ اسے بننے سنورنے کا کوئی شوق نہ تھا۔ اسے کمرے میں موجود اس شاندار اور ہینڈسم بندے سے زیادہ وہ ماڈلز قابل توجہ محسوس ہو رہے تھے۔ آنکھوں پر گولڈن فریم کا نازک سا چشمہ لگائے وہ بڑے انہماک سے وہی دیکھے جا رہی تھی۔ اسی وقت پیون نے چائے لاکر رکھی اور چینی ملا کر ان دونوں کے آگے کپ رکھتا واپس چلا گیا۔

مرتضیٰ نے فون بند کر کے اس سے کہا۔ "آپ چائے لیں۔" اس نے خاموشی سے کپ اٹھالیا اور چائے پینے لگی۔ "آپ نے صرف ایم بی بی ایس کیا ہے یا کسی خاص فیلڈ میں اسپیشلائزیشن بھی کی ہے۔" مرتضیٰ کے سوال پر وہ مسکرا دی اور بولی۔

"صرف ایم بی بی ایس کیا ہے۔ ویسے آپ کسی میڈیکل کے اسٹوڈنٹ سے پوچھیں تو اسے وہ پانچ سال پانچ صدیوں کے برابر محسوس ہوتے ہیں اور ان کے لیے "صرف" کا لفظ بہت بڑی زیادتی ہے۔" اس کی بات کو مرتضیٰ نے بہت انجوائے کیا تھا اس لیے ہنستے ہوئے بولا تھا۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا جو آپ سمجھیں۔" وہ بڑی فرصت سے بیٹھا اس سے بات چیت کو انجوائے کر رہا تھا۔ ابھی وہ کوئی جواب دینے ہی والی تھی کہ دستک دے کر علی اندر آگیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اسے صبح کی بات یاد آگئی جو وہ کام میں لگ کر بھول چکا تھا۔ اس لیے ایک دم گڑبڑا گیا۔ اسے دیکھ کر وہ فوراً اپنی کرسی سے کھڑی ہوگئی اور اس سے بولی۔

"کہاں رہ گئے تھے؟ میں کب سے انتظار کر رہی ہوں۔" پھر اس کے جواب دینے سے پہلے کہنے لگی۔

"میں گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔" علی نے بڑی فرماں برداری سے گردن ہلا دی تو وہ بیگ کندھے پر ڈالتی مرتضیٰ کی سمت مڑی۔

"اچھا مرتضیٰ صاحب، خدا حافظ! آپ کی مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ۔" وہ اس کی بات پر اپنی سیٹ سے کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

"میری مجبوری ہے کہ مجھے رسمی جملے بولنے نہیں آتے اس لیے میری طرف سے صرف خدا حافظ پر اکتفا کیجیے۔" وہ اپنی ذہانت سے بھرپور آنکھیں اس پر جمائے مسکرا کر بولا تو وہ ایک نظر اس پر ڈال کر کمرے سے نکل گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اگلے روز آفس سے واپس آکر کچھ دیر ریسٹ کرنے کے بعد علی کہیں جانے کی تیاری کرنے لگا تو وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ "ابھی تو آفس سے آئے ہو۔ اب پھر کہاں جانا ہے؟"

"مجھے مرتضیٰ نے ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔ وہیں کی تیاری ہے۔" وہ بالوں میں برش کرتا ہوا بولا تو وہ حیران

ہو کر پوچھنے لگی۔

"ڈنر؟ کس خوشی میں؟"

"خوشی وشی تو مجھے نہیں پتا۔ انہوں نے کہا آج رات کا کھانا میرے ساتھ پرائیوٹ میں کھاؤ اور میں نے ان کی دعوت قبول کر لی۔" وہ لاپروائی سے جواب دیتا پرفیوم اسپرے کرنے لگا تو وہ پرفیوم کی شیشی اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولی۔

"آخر بات کیا ہے؟ یہ مرتضیٰ ہاشمی تم پر کچھ ضرورت سے زیادہ ہی مہربان ہیں۔ کل میرے ساتھ بھی بہت وی آئی پی سلوک کیا تھا۔ پتا کرو کہیں ان کی کوئی بہن وہن تو نہیں ہے جس کے لیے وہ تمہیں ہموار کر رہے ہیں۔" علی اس کے شک و شبہے پر بے اختیار ہنس پڑا تھا۔

"پری! آپ بھی حد کرتی ہیں۔ ایسا ہی تو شہزادہ گلفام ہوں نا میں۔"

"ارے تمہیں کچھ نہیں پتا دنیا میں کیسے کیسے چالباز لوگ ہوتے ہیں۔ بہرحال تم محتاط رہو تو بہتر ہے۔" اس کی بات پر علی کو شرارت سوجھی تو سنجیدہ شکل بنا کر بولا۔

"فرض کریں ایسا ہے بھی تو اس میں آخر برائی کیا ہے۔ مرتضیٰ کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کی بہن بھی یقیناً "بہت خوبصورت ہوگی۔" وہ علی کی شرارت پر چڑ گئی اور اسے گھورنے لگی تو وہ ڈرنے کی ایکٹنگ کرتا ہوا بولا۔

"سچ کہہ رہا ہوں۔ مرتضیٰ کے بارے میں ہمارے ہاں ایک آرکیٹیکٹ [illegible] اس نے کمنٹس دیے ہیں کہ انہیں بلڈنگز اور فرنیچر وغیرہ ڈیزائن کرنے کے بجائے کم سے کم ماڈلنگ تو شروع کر ہی دینی چاہیے۔ بنسن اینڈ ہجز یا جلٹ کے ایڈورٹائزمنٹ کے لیے وہ بڑے موزوں ہیں۔ ویسے یہ کمنٹس ان کی غیر موجودگی میں دیے گئے تھے۔ ان کے سامنے کسی کی اس قسم کی بات کرنے کی مجال نہیں ہے۔" علی کی بات پر وہ بھی ہنس پڑی تھی۔ پھر علی چلا گیا تو وہ لاؤنج میں پاپا کے ساتھ بیٹھ گئی اور ٹی وی دیکھنے لگی۔ علی کی واپسی ساڑھے گیارہ بجے کے بعد ہوئی تھی۔

اگلے روز چھٹی کا دن تھا اس لیے وہ اور پاپا آرام سے بیٹھے ٹی وی دیکھنے میں مگن تھے جب علی کسی پاپ گانے کی دھن بجاتا اندر داخل ہوا۔

"کیوں بھئی صاحبزادے! آپ کا ڈنر کیسا رہا؟" پاپا نے علی سے پوچھا تو وہ پری کے برابر بیٹھتا ہوا بولا۔

"ایک دم فرسٹ کلاس۔ مرتضیٰ کی کمپنی اتنی اچھی ہوتی ہے کہ بوریت کا سوال ہی نہیں ہے۔"

"کیا ہے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو مجھے؟" وہ علی کو ایک ٹک اپنی طرف دیکھتا پا کر چڑ کر بولی۔

"آپ بہت خوبصورت لگ رہی ہیں اس لیے۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے تابیہ کی تعریف کی تھی۔

"ان لان کے کپڑوں اور الجھے ہوئے بالوں کے ساتھ میں صرف تمہیں ہی خوبصورت لگ سکتی ہوں۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولی تو علی ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

"ہو سکتا ہے اسی حلیے میں آپ کسی اور کو بھی خوبصورت لگ جائیں۔ آخر کو امید پر دنیا قائم ہے۔"

"پاپا دیکھیں اس علی کے بچے کو۔" وہ علی کی بکواس پر پاپا سے شکایت کرنے لگی تو وہ اسے پچکارتے ہوئے کہنے لگے۔

"بیٹا وہ مذاق کر رہا ہے۔ تم کیوں ناراض ہوتی ہو۔" علی ابھی بھی چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ سجائے بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کر کے دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"پری! خوش ہو جائیں۔ مرتضیٰ کی بہن کی انگیجمنٹ ہو رہی ہے۔ اب آپ ان بے چاروں کی نیت پر شک نہیں کر سکیں گی۔" علی ہاتھ میں دعوتی کارڈ پکڑے اس کے پاس کچن میں آکر بولا تو وہ Donuts فرائی کرتے ہوئے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈال کر بولی۔

"کیا پتا کوئی اور بہن بھی ہو۔" وہ تابیہ کی شرارت

بچھ کر خود بھی شرارتی انداز میں بولا۔
"میرا خیال ہے اس سسپنس کا خاتمہ انگیجمنٹ والے دن ہو جائے گا۔ پتا چل جائے گا کہ کتنی بھینس ہیں پھر آپ چل رہی ہیں میرے ساتھ انگیجمنٹ میں۔"

"میں کیا کروں گی جا کر۔ نہ میں کسی کو جانتی ہوں نہ کوئی میرا ان سے تعلق۔ تم چلے جانا۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس کے جواب پر علی کا منہ بن گیا تھا۔ مگر وہ اپنے اصرار سے باز نہ آیا تھا۔ شام میں دوبارہ اس سے چلنے کے بارے میں پوچھنے لگا تو وہ بری طرح چڑ گئی۔

"علی! مجھے اس طرح انجانے لوگوں میں جا کر بالکل مزہ نہیں آتا۔"

"انہوں نے اتنی محبت اور خلوص سے ہم سب کو بلایا ہے اور آپ نخرے کر رہی ہیں۔" پاپا خاموشی سے دونوں بہن بھائی کی نوک جھونک سن رہے تھے۔ علی کی بات پر وہ بےساختہ اپنے انداز میں ہنس پڑی تھی۔

"انہوں نے اخلاقاً سب کو انوائٹ کر لیا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم سب کے سب اٹھ کر پہنچ جائیں اور ایسے تو ہمارے گھر کتنے انویٹیشنز آتے ہیں جہاں سب کو بلایا جاتا ہے مگر ہم سب تو نہیں چل دیتے۔"

"دوسرے لوگوں میں اور مرتضیٰ بھائی میں بہت فرق ہے۔" علی نے خفگی بھرے انداز میں کہا تو وہ حیران ہو کر بولی۔

"مرتضیٰ بھائی؟ یہ مرتضیٰ تمہارے بھائی کب سے ہو گئے؟"

"میری ان سے بہت کلوز فرینڈشپ ہو گئی ہے اسی لئے انہوں نے مجھے اس بات کی اجازت دی ہے کہ میں انہیں بھائی کہہ سکتا ہوں۔ آفٹر آل وہ مجھ سے اتنے بڑے ہیں۔ پروفیشنل لیول پر تو بھائی یا انکل کہنا اچھا نہیں لگتا مگر جہاں دوستی ہو وہاں تو اچھا لگتا ہے۔ پلیز آپی چلیں ناں۔" علی نے اپنی بات ختم کر کے وہی دوبارہ مرغے کی ایک ٹانگ والا رویہ اپنا لیا تو پاپا بھی اسے سمجھانے لگے کہ جانے میں کوئی حرج نہیں۔ کسی سیمینار میں شرکت کرنی تھی۔ اس لئے ان کا جانا تو ناممکن تھا۔ علی کی ناراضگی اور پاپا کے اصرار پر آخر کار وہ آمادہ ہو گئی۔

اگلے روز علی لنچ ٹائم میں اسے لینے اسپتال پہنچ گیا۔ وہ حیران ہو کر اس کے آنے کی وجہ دریافت کرنے لگی۔ "بس آپ سے ایک کام تھا اسی لئے آیا ہوں۔ جلدی اٹھ جائیں۔ چلیں جلدی کریں۔" اس نے جلدی کا ایسا شور مچایا کہ وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنا اسٹیتھو سکوپ اور دو ایک چیزیں ہاتھوں میں لئے اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ علی نے گاڑی گھر پر لا کر روکی تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

"اب بتا بھی چکو مسئلہ کیا ہے؟"

"آپ اندر تو آئیں۔ ابھی پتا چل جائے گا۔" لاپروائی سے جواب دیتا آگے بڑھ گیا۔ اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر مائرہ بھی وہیں اس کے پیچھے چلی آئی۔ اندر گھس کر وہ اس سے کہنے لگا۔

"اپنی وارڈ روب کھولیں اور آپ کے پاس جتنے اچھے ڈریسز ہیں وہ سب مجھے دکھائیں۔" وہ علی کے حکیمانہ انداز پر چڑ گئی۔

"کیوں تمہیں میرے کپڑوں سے کیا کام ہے؟"

"مجھے یہ کام ہے کہ آج رات میں جس فنکشن میں ہمیں جانا ہے وہاں بہت سارے لوگ اور دیگر جاننے والے بھی مدعو ہیں اور میں ان سے تعارف تو ہرگز نہیں کروا سکتا کہ جو بڑی بی ٹائپ کے کپڑوں میں ملبوس خاتون کھڑی ہیں یہ میری بہن ہیں۔ لہٰذا آپ کے کپڑوں کا انتخاب میں کروں گا۔" علی نے خود ہی آگے بڑھ کر اس کی وارڈ روب کھول لی اور ایک ایک کر کے ہینگ ہوئے تمام ڈریسز نکالنے لگا۔ وہ خاموشی سے کھڑی علی کی تمام کارروائی دیکھ رہی تھی۔

کچھ دیر تمام کپڑوں کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے بڑی مایوسی سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "ایسا لگ رہا ہے کہ یہ کسی ساٹھ ستر سالہ خاتون کی وارڈ روب ہے۔ کوئی ایک بھی جوڑا ایسا نہیں جو آپ کی ایج کے لحاظ سے مناسبت رکھتا ہو۔"

"ٹھیک ہے تو میں نہیں جاتی۔ جب مجھے لے جانے سے تمہاری انسلٹ ہوتی ہے تو مجھے بھی جانے کا کوئی شوق نہیں۔" وہ برا مان کر بولی تو علی نے اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اس کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اسے دوبارہ پورچ میں آ کر گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ جھنجلا گئی۔

"علی آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ اب کہاں جا رہے ہو؟" وہ کوئی جواب دیئے بنا اسے اپنی برابر والی سیٹ پر بٹھا کر خود بھی ڈرائیونگ سیٹ پر آیا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ وہ علی کے پراسرار انداز پر زچ سی ہو گئی تھی۔

گاڑی مین روڈ پر لا کر ایک بوتیک کے سامنے روک کر علی گاڑی سے اترا تو وہ بھی اتر آئی۔ علی کیا چاہ رہا تھا اسے اس کی سمجھ میں اچھی طرح آ گیا تھا۔ مگر وہ جانتی تھی علی کسی بھی بحث مباحثے کے لئے موزوں نہیں۔ اس لئے وہ خاموشی سے اس کے ساتھ اندر آ گئی۔ علی بغور مختلف کپڑوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ وہاں موجود سیلز گرل نے اس سے اس کی پسند پوچھ کر اب خود ہی آگے بڑھ کر مختلف ڈریسز دکھانے شروع کر دیئے تھے مگر کوئی لباس بھی علی کے معیار پر پورا نہیں اتر رہا تھا۔ وہ صرف خاموش تماشائی کی حیثیت سے علی کے ہم قدم تھی۔ آخر کار علی کو ایک جوڑا پسند آ ہی گیا تھا۔ کاٹن نیٹ اور لائٹ پنک کلر کا جس کی قمیص کافی بھاری کام اور چاند ستاروں سے مرصع تھی۔ پنک پلین کاٹن کی شلوار اور لیس ہی کے میٹریل کا دوپٹہ جس پر نگ لگے ہوئے تھے۔ علی کو اتنا بھاری جوڑا پسند کرتا دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

"علی! ہمارے کسی کزن کی شادی نہیں ہے جس میں میں اتنا بھاری ڈریس پہن کر جاؤں۔" علی نے اس کی مخالفت پر دھیان دیئے بغیر سوٹ پیک کروایا اور پیمنٹ کی اور بوتیک سے باہر آ گیا تو اس سے بولا۔

"کزنز کی شادیوں میں کون سا آپ پہلے سے تیار ہوتی ہیں۔ آپ کو تو شوق ہے اپنے اوپر بڑھاپا طاری کرنے کا۔ بہرحال آج آپ میری پسند کی تیاری کریں گی۔" اسے برے برے منہ بناتا دیکھ کر وہ ہنس پڑا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ شام تک علی اس کی منت سماجت کر کے اسے اس بات پر آمادہ کر چکا تھا کہ وہ اس کا خریدا ہوا سوٹ پہنے۔ وہ علی کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی اس لئے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سوٹ پہن لیا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بال برش کر رہی تھی جب علی اس کے کمرے میں آیا۔ اسے نک سک سے درست تیار دیکھ کر وہ بولی۔

"تیار ہو گئے تم۔ بس پانچ منٹ رکو میں بھی تیار ہی ہوں۔" علی نے ایک بھرپور نظر اس کے سراپے پر ڈالی اور بولا۔

"آپی! آپ کو پتا ہے آپ کتنی حسین ہیں۔ بغیر کسی میک اپ کے صرف ان کپڑوں ہی میں آپ اتنی پیاری لگ رہی ہیں۔" وہ اس کی تعریف پر ہنس پڑی تھی۔ خود اسے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ علی اس کے برابر میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"جب میرے کہنے سے یہ کپڑے پہن لئے ہیں تو باقی تیاری بھی میری مرضی سے کریں۔"

"اب اور کیا کروں؟" وہ علی کی فرمائشوں پر عاجز ہوئی۔

"صحیح سے میک اپ کریں اور آج یہ گلاسز لگانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پاپا نے کونٹیکٹ لینسز سجانے کے لئے نہیں دلوائے تھے۔ ان گلاسز کے پیچھے آپ کی گرے گرین آنکھوں کی خوبصورتی بالکل چھپ جاتی ہے۔"

"جب بقول تمہارے میں اتنی خوبصورت ہوں تو پھر تو مجھے کسی قسم کے میک اپ کی کوئی ضرورت نہیں ہونی چاہئے۔" وہ برش رکھتے ہوئے بولی۔ علی نے ڈریسنگ ٹیبل کا تفصیلی جائزہ لے کر Foundation کا aqua اس کے ہاتھ میں پکڑایا اور بولا۔

"آج اس خوبصورتی کو چار چاند لگائیں میری

خاطر۔ میرا دل چاہ رہا ہے آج وہاں بس آپ ہی آپ ہوں۔ آپ سے زیادہ کوئی اچھا نہ لگے۔" پھر علی اس کے سر پر کھڑا ہو کر اسے میک اپ کرتا دیکھتا رہا۔ وہ میک اپ کے بارے میں اس کی اتنی معلومات پر حیران تھی۔

"سچ سچ بتاؤ۔ آخر چکر کیا ہے؟ تمہیں میک اپ کی چیزوں کے بارے میں اتنی درست معلومات کون فراہم کرتا ہے۔" وہ اس کے مشکوک انداز پر ہنس دیا اور بولا۔

"آخر ہم بھی تو آنکھیں رکھتے ہیں۔ صبح سے شام تک بے شمار لڑکیوں سے ملتا ہوں اور میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے اکثر کو اگر میں بغیر میک اپ کے دیکھوں تو چیخ اٹھوں۔ آپ تو پتا نہیں کون سی دنیا میں رہتی ہیں۔" اس کے سوٹ کے ساتھ پہننے کے لیے جیولری بھی علی نے منتخب کی۔ اپنے ہاتھوں سے اسے کانچ کی چوڑیاں پہنائیں۔ پرفیوم اسپرے کیا جب اس نے حسب عادت بالوں کی چوٹی بنانی چاہی تو علی نے ٹوک دیا۔

"ایسے ہی اچھے لگ رہے ہیں۔ آج بال کھول لیں۔"

"علی میں اپنی سسرال نہیں جا رہی ہوں۔" وہ تنگ آ گئی۔

"تو بھی ہے آپ آج میری مرضی سے ہی تیار ہوں گی۔" علی نے اس کے ہاتھ سے لے کر برش رکھ دیا اور اس کا ہاتھ پکڑے کمرے سے باہر نکلا۔ پاپا بھی تیار ہو کر جانے کی تیاری کر رہے تھے اسے اور علی کو آتا دیکھ کر رک گئے۔

"پاپا دیکھیں میں نے پری کو کتنا اچھا تیار کروایا ہے۔" علی نے پاپا کو دور سے آواز دے کر پکارا وہ بڑی محبت پاش نگاہوں سے بیٹی کو دیکھ رہے تھے اس کے قریب آنے پر انہوں نے بے اختیار آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چومی تھی اور نظر کی دعا پڑھ کر پھونکی تھی۔ اس سے انہیں اس میں حمیرا نظر آئی تھی۔ وہ بالکل اپنی ماں کی طرح تھی۔ وہ اچانک کچھ سوچ کر افسردہ سے ہو گئے تھے مگر بچوں کے سامنے فوراً خود کو نارمل ظاہر کر کے مسکراتے ہوئے بولے۔

"علی میری بیٹی کا دھیان رکھنا۔ کہیں دوستوں میں لگ جاؤ اور یہ بور ہوتی رہے۔" وہ پاپا کے ہدایت نامے پر ہنستے ہوئے گردن ہلا گیا تھا۔

وہ علی کے ساتھ Carlton ہوٹل کے ایرینا کورٹ یارڈ میں داخل ہوئی تو سخت نروس ہو رہی تھی۔ اس قسم کی تیاری اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ کی تھی۔

"علی مجھے سخت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔" علی کا ہاتھ پکڑ کر وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولی تو وہ اس کی شکل دیکھ کر ہنس پڑا۔

"اور مجھے بہت فخر محسوس ہو رہا ہے کہ یہ اتنی خوبصورت خاتون میری کزن ہیں۔ بائی دا وے آپ کو اتنی گھبراہٹ ہے کس بات پر؟" وہ اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ محسوس کر کے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ انہی باتوں کے دوران چلتے ہوئے وہ دونوں استقبالیہ تک پہنچ گئے تھے۔

مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیے دونوں طرف قطار میں بہت سے لوگ کھڑے تھے جن میں سے وہ کسی کو بھی نہیں جانتی تھی۔ علی نے ان میں سے تین لوگوں سے ہاتھ ملائے اور آگے بڑھا تو وہ بھی اس کے ساتھ چلنے لگی۔ کچھ فاصلے پر راؤنڈ ٹیبل کے پاس کھڑے کسی سے باتیں کرتے مرتضیٰ کی نظر ان دونوں پر پڑی تو وہ ان صاحب سے معذرت کرتا تیزی سے ان لوگوں کے پاس آ گیا۔ پتا نہیں کیوں اسے ایسا لگا جیسے اسے دیکھ کر مرتضیٰ کی آنکھوں میں ایک دم بڑی واضح سی چمک پیدا ہوئی ہے۔ وہ علی کا شکریہ ادا کر کے اس سے خیر خیریت دریافت کرتا اچانک اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"اور آپ کیسی ہیں؟" تانیہ نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑے عام سے انداز میں اس کی خیریت پوچھ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے آنکھوں میں ابھرنے والی چمک بھی اب نظر نہیں آ رہی تھی۔

"I m fine thankyou"

"آؤ علی میں تمہیں اپنی ماما سے ملواؤں۔" اس کے جواب دینے کے ساتھ ہی مرتضیٰ نے علی سے کہا تو علی نے فوراً قدم آگے بڑھائے اور اس سے بولا۔

"آئیں پری۔ مرتضیٰ بھائی کی ماما سے مل کر آتے ہیں۔" ان دونوں کے ساتھ چلتی وہ نظریں جھکائے ہوئے بھی یہ بات محسوس کر گئی تھی کہ اچانک ہی وہ محفل میں مرکز نگاہ بن گئی ہے۔ بہت سے لوگ اسے بغور دیکھ رہے ہیں۔ وہ اتنے لوگوں کی خود پر مرکوز نگاہوں سے کنفیوز سی ہو رہی تھی۔ اس کے برابر چلتے مرتضیٰ نے بڑے غور سے اس کی نروس شکل کی طرف دیکھا تھا۔

علی کو اچانک وہاں ایک ٹیبل کے پاس اپنے کچھ پرانے دوست نظر آ گئے تو بولا "آپ چلیں مرتضیٰ بھائی میں ابھی ان لوگوں سے ہائے ہیلو کر کے آتا ہوں۔" مرتضیٰ نے اس کی بات پر گردن ہلا دی اور آگے چلنے لگا تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے؟ کیونکہ ان میں سے کسی کو وہ بالکل بھی نہیں جانتی تھی اور مرتضیٰ کے ساتھ یوں جانا اسے بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ اسے یوں بیچ میں جھجکتا دیکھ کر مرتضیٰ بھی ایک دم رک گیا تھا۔

"کیا ہوا؟ آپ رک کیوں گئیں؟ آگے چلیے۔" وہ خود کو سخت مشکل میں محسوس کر رہی تھی۔ بڑی مشکلوں سے اپنا اعتماد بحال کر کے وہ مرتضیٰ کے ساتھ چلنے لگی۔ کچھ فاصلے پر پہنچ کر مرتضیٰ ایک خاتون کے پاس پہنچ کر رک گیا تھا۔ بلیک کلر کی سلک کی ساڑھی پر بہت ہی باریک بارڈر بنا ہوا تھا۔ وہ ایک بے حد گریس فل شخصیت کی حامل خاتون تھیں۔ ان کے ساتھ ایک اور نسبتاً ینگ خاتون بھی کھڑی تھیں۔

"ماما یہ تانیہ ہیں۔" وہ مرتضیٰ کے تعارف کے انداز پر حیران رہ گئی۔ اس کی ماما تو شاید علی کو بھی نہ جانتی ہوں تو اس کی کزن کو کیسے جانیں گی۔ مگر اگلا پل اس کے لیے حیرت انگیز تھا۔ وہ خاتون اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ایک دم اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں اور ایک بہت ہی گہری نگاہ اس پر ڈال کر مسکرا دی تھیں۔

اسے اپنا آپ اس لمحے بڑا عجیب سا لگا تھا۔ بھلا علی کے بغیر اس کی ماما سے ملنے کے لیے آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

"کیسی ہو تانیہ؟" انہوں نے اس طرح اس کی خیریت دریافت کی۔ جیسے اس سے پہلے بے شمار مرتبہ مل چکی ہوں۔ وہ اپنی بد اخلاقی پر شرمندہ سی ہوتی فوراً بولی۔

"السلام علیکم۔ میں ٹھیک ہوں۔" وہ اس کے اتنی دیر بعد سلام کرنے پر بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں اور بولی تھیں۔

"وعلیکم السلام۔" ان کے ساتھ کھڑی وہ دوسری خاتون بھی بڑی گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس طرح کی صورت حال کا سامنا وہ زندگی میں پہلی مرتبہ کر رہی تھی اور اپنے نروس ہونے پر اسے خود پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اسی وقت علی بھی وہاں آ گیا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ اچانک ایسا لگا جیسے وہ محفوظ ہو گئی ہے۔ بے اختیاری میں اس نے دھیرے سے علی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ کہ وہ کہیں پھر نہ غائب ہو جائے۔ اس کے اس طرح علی کے ہاتھ پکڑنے کو کسی اور نے تو نہیں دیکھا مگر مرتضیٰ کی تیز نگاہوں سے یہ چیز چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ بے اختیار ایک گہری مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا تھا۔

علی نے مرتضیٰ کے تعارف کروانے پر اس کی ماما کو سلام کیا تو انہوں نے بڑی خوش دلی سے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔ "بہت ذکر سنا ہے تمہارا مرتضیٰ سے بلکہ ابھی بھی تمہارے بارے میں بتا رہی تھی۔" ان کی بات پر علی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے امید ہے ذکر تعریفی ہی تھا۔" وہ اپنے باقی تمام مہمانوں کو فراموش کیے ان دونوں کی طرف مکمل طور پر متوجہ تھیں۔ تانیہ کو ان کی خود پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد پڑنے والی گہری نگاہوں سے سخت الجھن ہو رہی تھی۔

"اور بیٹا آپ کیا کرتی ہیں؟" انہوں نے تانیہ سے پوچھا تو اس نے ان کی طرف دیکھ کر حیرت سے

جواب دیا۔
"میں نے میڈیسن پڑھی ہے اور اپنے پاپا ہی کے ہاسپٹل میں کام کرتی ہوں۔" وہ اپنا اعتماد کسی حد تک بحال کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی اس لیے بڑے سکون سے جواب دیا تھا۔ اس کے جواب پر انہوں نے ایک ستائشی نگاہ اس کے سراپے پر ڈالی تھی۔ مرتضیٰ کی ماما سے فارغ ہو کر علی اسے اپنے کزنز سے ملوانے لے گیا۔ خود مرتضیٰ ان دونوں کو چھوڑ کر اپنے دیگر مہمانوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ علی کے کزنز کے ساتھ ہی وہ دونوں بھی اسی ٹیبل پر بیٹھ گئے اور باتیں ہونے لگیں۔ ان میں ایک دو خواتین بھی تھیں اس لیے وہ بور نہیں ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد مرتضیٰ کی ماما اپنے ساتھ دو لڑکیوں کو لیے اس کے پاس آگئیں اور اس سے بولیں
"ثانیہ ان دونوں سے ملو۔ یہ میری بڑی بیٹی ہے صبا اور یہ اس سے چھوٹی شفاء۔" وہ اپنی کرسی پر سے کھڑی ہو کر ان دونوں سے ہاتھ ملانے لگی۔ ان دونوں کی ڈریسنگ کا انداز ہی بتا رہا تھا کہ وہ شادی شدہ ہیں۔ اس سے ملتے وقت ان دونوں ہی نے بڑی گرم جوشی اور ایکسائٹمنٹ کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ہم بہن بھائی میں سب سے بڑے مرتضیٰ بھائی ہیں پھر میں ہوں میرے بعد شفاء اور ہم سب سے چھوٹی ایمن جس کی آج انگیجمنٹ ہے۔" صبا نے اس کی طرف [illegible] بتایا تو اس نے گردن ہلا دی۔ میز پر موجود باقی لوگ بھی اسی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ جز بز ہوتی صبا کو دیکھ رہی تھی جس نے ہاتھ ملانے کے بعد ابھی تک اس کا ہاتھ بڑی محبت سے تھاما ہوا تھا۔ دو چار منٹ وہ لوگ اس سے رسمی سی باتیں کرتی رہیں مگر ثانیہ کو ایسا لگا جیسے وہ باتیں کرنے سے زیادہ اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنے برابر بیٹھے علی سے بولی۔

"علی گھر چلو۔" علی نے اس کا تھکا اور بے زار سا انداز دیکھ کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو وہ آہستہ آواز میں بولی۔ "مجھے سخت بوریت ہو رہی ہے اور مجھے فوراً گھر واپس جانا ہے۔"

"ارے بہن بھائی میں کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں؟" علی کی کولیگ مسز خرم نے دریافت کیا تو وہ مسکراتے ہوئے انہیں اپنی گھر واپسی کا بتانے لگی۔ پھر علی کے تمام ساتھیوں سے خدا حافظ کہتی وہ کھڑی ہو گئی۔ اس کے انداز سے علی کو پتا چل گیا تھا کہ اب مزید وہ ایک سیکنڈ بھی نہیں رکے گی اس لیے وہ بھی بغیر کسی حجت کے کھڑا ہو گیا تھا۔ واپسی کے راستے پر چلتا علی ادھر ادھر نظریں دوڑا کر مرتضیٰ کو تلاش کر رہا تھا کہ اس سے اجازت لے سکے۔

تین چار افراد کے ساتھ کھڑا باتیں کرتا مرتضیٰ اسے نظر آیا تو وہ آگے بڑھ کر اس کی طرف چلا گیا۔ وہ وہیں کھڑی علی کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے کھڑی علی کی واپسی کی منتظر اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ علی کی بات سن کر مرتضیٰ بھی اس کے ساتھ چلتا ہوا اس کی طرف آگیا۔ اس کے پاس آ کر وہ ثانیہ سے بولا۔

"آپ کے آنے کا بہت شکریہ۔ ویسے یہ جو ایمن ہے میری سب سے چھوٹی بہن ہے اور اس سے بڑی دونوں بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔" وہ اس کے منہ سے اتنی غیر متعلقہ بات سن کر حیران رہ گئی۔ وہ اسے اپنی فیملی کی تفصیلات کس خوشی میں فراہم کر رہا تھا۔ [illegible] چہرے پر پڑی تو وہاں ایک مسکراہٹ اور آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارت آگئی۔ اچانک اس کی نظر علی پر پڑی تو وہ بھی مسکراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کرتا نظر آیا۔ اس کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا۔ اس کے چہرے پر پھیلتے ناگواری کے رنگ علی سے چھپے نہ رہ سکے تو وہ جلدی سے مرتضیٰ سے ہاتھ ملا کر الوداعی کلمات ادا کرنے لگا۔ وہ علی سے پہلے ہی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی تھی۔ راستے میں علی نے دو تین مرتبہ اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے علی کی کسی بھی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور گھر آتے ہی اپنے کمرے میں گھس گئی۔ اگلا پورا

دن اس نے علی سے بات کیے بغیر گزارا۔ رات میں وہ اکیلی لان میں واک کر رہی تھی جب علی بھی آ کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"کری آپ مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟" اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔

"کری پلیز مجھ سے بات کریں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ملتجیانہ انداز میں بولا تو اس نے علی کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

"do you take me for afool Ali۔"

"ہرگز نہیں۔" علی نے پرزور انداز میں اس کی بات کی تردید کی۔

"ایک ایسی بات جو ہم بہن بھائی کے درمیان ہوئی تھی کیا تمہیں اسے بتانی چاہیے تھی؟" وہ ناراض لہجے میں بولی۔

"بلیو می میں نے انہیں کوئی بات نہیں بتائی۔ آپ کے خیال سے کیا میں اتنا احمق ہوں کہ انہیں ان کے اور ان کی بہنوں کے بارے میں آپ کے نادر و نایاب خیالات بتاؤں گا۔ فرینڈشپ اپنی جگہ ہے لیکن میں نے انہیں کوئی بات نہیں بتائی تھی۔" علی کی بات پر وہ طنزیہ انداز میں ہنسی۔

"پھر شاید انہیں فرشتوں نے آ کر بتایا ہو گا۔" وہ علی کی غلط بیانی پر چڑ گئی تھی۔

"کری میرا یقین کریں۔ میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ آپ کی طرح ان کی بات پر میں بھی حیران ہوا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ان کی ذہانت کا بھی قائل ہو گیا تھا۔ یہ بات تو آپ بھی مانتی ہیں کہ مرتضیٰ بھائی غیر معمولی ذہین تو ہیں۔ مجھے تو کبھی کبھی ان کی ذہین آنکھوں سے خوف آنے لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کوئی ایکس رے مشین ہے جو ہمارے اندر کا سارا حال چیک کر رہی ہے۔ وہ آپ کے فیس ایکسپریشنز سے شاید کوئی بات بھانپ گئے تھے۔ آپ ان کی بہنوں اور کزنز کو دیکھ بھی تو قطعاً" ٹیپیکل بہنوں والے اسٹائل میں دیکھ رہی

تھیں۔" علی نے اپنی بات کے اختتام پر اس کی طرف شوخ نظروں سے دیکھا تھا۔ جبکہ وہ ہنوز سنجیدہ شکل بنائے واک کر رہی تھی۔

"پھر بھی آئندہ میں تمہارے ساتھ تمہارے کسی جاننے والے کے ہاں ہرگز نہیں جاؤں گی۔" اس کی بات پر علی نے بڑی عاجزی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کری وہ — تم سے مذاق کر رہے تھے۔"

"لیکن میرا ان کے ساتھ مذاق کا کوئی رشتہ نہیں ہے جو وہ میرے ساتھ مذاق کرتے پھریں۔ سمجھا دینا اپنے مرتضیٰ بھائی کو۔" وہ پیر پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ کون تھا وہ جو اس کی شخصیت کے گرد کھنچے حصار کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک قلعے میں قید کر رکھا تھا اور کسی کو بھی وہ اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ وہ اس قلعے میں داخل ہو۔ وہ کمرے میں لیٹ کر بھی بہت دیر تک کھولتی رہی تھی۔ اگلے روز سے اس نے علی کے ساتھ اپنا رویہ نارمل کر لیا تھا۔ وہ علی کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اسے اصل غصہ اس کی ماما اور بہنوں کے انداز پر آیا ہے۔ وہ نا سمجھ بچی نہیں تھی جو ان کے انداز سے کچھ سمجھ نہ پاتی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس روز سنڈے تھا۔ اس کی ساتھی ڈاکٹر، ڈاکٹر میمونہ عابد کے ہاں محفل میلاد تھی اور وہ اس میں شرکت کے لیے ان کے گھر گئی ہوئی تھی۔ مغرب سے کچھ پہلے اس کی واپسی ہوئی تھی۔ وہ خوشگوار موڈ کے ساتھ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو پاپا اور علی کے ساتھ صوفے پر بیٹھے مرتضیٰ کو دیکھ کر اس کا منہ حلق تک کڑوا ہو گیا۔ دروازہ کھلنے پر ان تینوں ہی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"السلام علیکم پاپا۔" وہ سلام کرتی پاپا کا جواب سنے بغیر ہی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ شعیب صاحب کی اس بد اخلاقی پر سخت متعجب تھے۔ وہ اپنے اعلیٰ اخلاق، رکھ رکھاؤ کی وجہ سے ہر جگہ سراہی جاتی تھی

اور اس وقت مہمان کو سلام کیے بغیر وہ کتنی بدتمیزی سے اوپر چلی گئی تھی۔

انہوں نے بڑی شرمندگی کے ساتھ مرتضیٰ کی طرف دیکھا تو وہ بڑے آرام سے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی ناراضی کے کوئی تاثرات نہیں تھے۔ وہ اس کی اعلیٰ ظرفی پر حیران ہوئے۔ اس نے اپنی انسلٹ کا برا نہیں منایا تھا۔ پھر اب کی بدتمیزی کا اثر زائل کرنے کے لیے وہ سارا وقت مرتضیٰ اور علی کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔

وہ اپنے کمرے میں آ کر آرام سے بیٹھ گئی تھی۔ اس کی بلا سے اگر کریم بابا نے چائے پیش کر دی تو اچھی بات ہے اور اگر نہیں کی تو میں کیا کروں۔ وہ نماز پڑھ کر میگزین کی ورق گردانی کرنے لگی۔ اسے اس طرح حجرہ نشین ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ رات کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا اور اسے معلوم تھا کہ علی بھوک کا کتنا کچا ہے۔ جانے سے پہلے وہ چپلی کبابوں کا مسالا تیار کر کے گئی تھی۔ اب صرف تلنے کا کام رہتا تھا۔ پلاؤ کے لیے یخنی بھی تیار تھی صرف چاول بگھارنے تھے۔ یہ تمام کام کریم بابا کے بس کی بات نہیں تھی اس لیے وہ اپنے کمرے سے نکل آئی۔

لاؤنج سے ابھی بھی ان تینوں کی باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ موصوف بڑی ہی فرصت سے آ کر بیٹھے ہیں ان نے جل کر سوچا تھا۔ پھر جب تمام چیزیں تیار ہو گئیں اور اس نے کھانا میز پر چن دیا تو کریم بابا سے ان لوگوں کو کھانے کے لیے بلانے کا کہہ کر دوبارہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ اپنی پلیٹ میں سلاد ڈالتے ہوئے پاپا نے کریم بابا سے اس کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگے۔

"بٹیا کہہ رہی ہیں انہیں بھوک نہیں ہے بعد میں کھائیں گی۔"

"ایسی ہی ہے وہ کھانے پینے کے معاملے میں۔ وہاں میلاد میں ذرا کچھ چکھ لیا ہو گا بس اب کھانا نہیں کھائے گی۔" پاپا نے مرتضیٰ سے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی تھی۔ رات دس بجے

مرتضیٰ کی واپسی ہوئی تو وہ اپنے کمرے سے نکل پایا سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے اور علی بھی شاید اپنے بیڈ روم میں تھا۔ وہ کچن میں آ کر اپنے لیے کھانا نکالنے لگی۔

وہ علی سے صاف صاف لفظوں میں کہنا چاہتی تھی کہ اسے مرتضیٰ ہاشمی کی اپنے گھر آمد و رفت پسند نہیں اس لیے اس دوست کو گھر سے باہر ہی رکھو۔ مگر ایک جھجک سی آڑے آ رہی تھی وہ اپنی ناپسندیدگی کی کیا وجہ بتائے گی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ تھا کہ وہ دفاعی حکمت عملی اختیار کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔ مقابل کے وار کا سامنا کرنے کی ہمت اسے خود میں نظر نہیں آ رہی تھی اسے اپنا یہ defensive ہونا اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر وہ اس طرح ڈرتا ہوا گھستا چلا آ رہا تھا کہ وہ اپنے قلعے کے دروازے مضبوطی سے بند کیے خود کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ اور علی لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی پر اسٹار اسپورٹس دیکھ رہے تھے۔ فون کی بیل پر تابندہ نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف مرتضیٰ کی آواز سنائی دی۔

"السلام علیکم۔ میں مرتضیٰ بات کر رہا ہوں۔"

"وعلیکم السلام۔" اس نے سلام کا جواب دینے کے ساتھ ہی کسی اگلی بات سے قبل ہی اس نے ریسیور علی کی طرف بڑھایا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا "کون ہے؟" اس نے اشارے سے پوچھا تو وہ با آواز بلند بولی۔

"آپ کے مرتضیٰ بھائی کا ہے۔" اس کی آواز دوسری طرف بڑے آرام سے سنی گئی ہو گی اس بات کا اسے صد فی صد یقین تھا۔ علی نے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا اور بات کرنے لگا۔ وہ ٹی وی بند کر کے وہاں سے اٹھ گئی۔ کچن سے پانی کی کر وہ لان میں جا رہی تھی۔ علی ابھی بھی مرتضیٰ سے بات کر رہا تھا۔

"آپ کو خود ہی شوق ہے مشکل کام کرنے کا۔ میں نے تو پہلے ہی بتایا تھا۔" وہ پتا نہیں کس کام کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ دوسری طرف اس نے کیا کہا یہ

جواب سنا تھا کہ علی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔
"مرتضیٰ بھائی یہ آپ کی زندگی کا مشکل ترین پروجیکٹ ہے۔ اس سے کہیں آسان تو اہرام مصر کی ڈیزائننگ رہی ہوگی۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ دونوں شاید اپنے کسی نئے پروجیکٹ کو ڈسکس کر رہے تھے۔ تانیہ لان میں چلی گئی تھی۔ علی نے اسے یہاں آتے اور ان کی طرف جاتے نہیں دیکھا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

چھٹی کا دن تھا وہ علی کے ساتھ گھر کے روزمرہ استعمال کا سامان خریدنے سپر مارکیٹ آئی تھی۔ گھر والوں کی خوراک کے بارے میں وہ جتنی فکر مند رہا کرتی تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ فروٹ، سبزی، گوشت سب کچھ خود خرید کر لائے۔ تقریباً دو گھنٹے علی بے چارہ اس کے ساتھ خوار ہوا تب کہیں جا کر اس کی شاپنگ مکمل ہوئی۔ واپسی میں گھر جانے کے بجائے علی نے گاڑی دوسرے راستے پر ڈالی تو وہ پوچھنے لگی۔
"کہاں جا رہے ہو؟" وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا بولا۔
"مرتضیٰ کے گھر۔ ہمارے گھر سے قریب ہی ہے ان کا گھر۔ مجھے ان سے ایک ضروری فائل لینی ہے۔ صرف دو تین منٹ لگیں گے۔" وہ اس کے جواب پر بدمزگی سے بولی۔
"علی پہلے مجھے گھر ڈراپ کرو پھر جہاں بھی جانا ہے جاؤ۔"
"پری کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ ایسا بھی ان بے چاروں نے آپ کے ساتھ کچھ نہیں کیا جو آپ کی ان سے اتنی دشمنی ہو جائے۔" وہ علی کے جواب پر ناراض شکل بنا کر چپ ہو گئی۔ پانچ چھ منٹ بعد ہی گاڑی ایک شاندار سے مکان کے سامنے روک کر علی باہر نکلا۔
اسے دیکھ کر چوکیدار پورا گیٹ کھولنے لگا۔ وہ اس مکان کی طرف سے رخ موڑ کر قصداً دوسری طرف دیکھنے لگی۔ علی نے ایک نظر اس پر ڈالی اور اندر چلا گیا۔ علی کو گئے تین چار منٹ ہو گئے تھے۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ مرتضیٰ یا اس کے گھر کے کسی فرد سے اس کی ملاقات نہ ہو۔ علی گیٹ سے باہر نکلتا نظر آیا تو اس نے شکر ادا کیا۔ مگر ان کے پیچھے مرتضیٰ کی ماما کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کو بوکھلا گئی۔ انہیں گاڑی کی طرف آتا دیکھ کر وہ جلدی سے باہر نکل آئی اور ان سے پہلے چلتی ان کے پاس آ گئی۔
"السلام علیکم۔" اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد وہ خفگی بھرے لہجے میں بولیں۔
"یہاں تک آ کر باہر سے ہی چلی جاؤ گی۔ علی کہہ رہا تھا کہ تم نے اندر آنے سے منع کر دیا ہے کیوں، بھئی کیا ہم لوگ تمہیں اچھے نہیں لگتے۔" وہ اپنائیت سے بولیں تو وہ بری طرح شرمندہ ہو گئی۔
"ایسی بات نہیں ہے آنٹی اصل میں اس وقت مجھے جلدی ہے اس لیے۔" وہ اس کی وضاحت سے قطعاً مطمئن نہ ہوئیں اور بولیں۔
"تم مجھے علی کے سامنے شرمندہ کراؤ گی۔ چلو اندر شاباش۔" وہ اتنی بڑی خاتون اسے خود گیٹ پر آ کر بلا رہی تھیں وہ اتنی بدتمیز کبھی بھی نہیں تھی کہ انہیں منع کر دیتی سو ناچار اس نے ان کے ساتھ گیٹ کے اندر قدم رکھ دیا۔ ان کے ساتھ چلتے اس نے لاؤنج میں قدم رکھا تو سامنے ہی صوفے پر مرتضیٰ اور ایک لڑکی بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں ہی کے چہروں پر اسے دیکھ کر خیر مقدمی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ مرتضیٰ نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے اسے سلام کیا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ اسے گھر آئے مہمان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں سمجھا رہا تھا۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی تو اس نے اپنے گھر میں مرتضیٰ کی عزت افزائی کی تھی۔
وہ لڑکی اس کے پاس آ کر مسکراتے ہوئے بولی تھی۔
"Hello ! I'm Aiman" اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جسے تانیہ نے تھام لیا اور مسکراتے ہوئے اس کے ہیلو کا جواب دیا۔
"تو ماما آپ کو اندر لے ہی آئیں۔ علی کہہ رہا تھا کہ آپ کو گھر جانے کی بہت جلدی ہے۔" اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے ایمن نے کہا تو اس نے صرف

مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ مرتضیٰ کی ماما بھی اس کے برابر والے صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔ علی اور مرتضیٰ ان لوگوں کے سامنے والے صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وائٹ ٹی شرٹ اور بلیک جینز پہنے بکھرے بالوں کے ساتھ وہ اس سوٹ اور ٹائی والے مرتضیٰ سے خاصا مختلف لگ رہا تھا۔
"ایمن جاؤ اپنے ڈیڈی کو بلا کر لاؤ۔" آنٹی نے اس سے کہا تو وہ فوراً حکم کی تعمیل میں اٹھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اور مرتضیٰ کے ڈیڈی لاؤنج میں داخل ہوئے۔ علی سے شاید وہ پہلے بھی مل چکے ہوئے تھے اس لیے خوشدلی سے بولے۔
"کیسے ہو علی۔" علی نے جواب میں مسکراتے ہوئے کہا۔
"بالکل ٹھیک آپ سنائیں۔"
"ہم بھی ٹھیک ہی ہیں یار۔ بس آج کل تمہاری آنٹی نے میٹھا کھانے پر پابندی لگائی ہوئی ہے اس لیے زندگی بڑی پھیکی گزر رہی ہے۔" ان کی بات پر وہاں موجود سب لوگ ہنس پڑے تھے۔
"ڈیڈی آپ تانیہ سے تو ملے نہیں۔" ایمن نے کہا تو وہ صوفے پر بیٹھتے بیٹھتے رک گئے اور بغور اسے مسکراتے ہوئے دیکھنے لگے۔ اس نے انہیں سلام کیا جس کا انہوں نے بڑے پرتپاک انداز میں جواب دیا اور اپنے بیٹے کے برابر میں ٹک گئے۔
"علی یہ تم نے ہمارے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی ہے۔ یہ اتنی پیاری لڑکی کو آج تک چھپا کر کہاں رکھا ہوا تھا۔" انہوں نے علی کو مخاطب کیا۔ ان کی بات پر وہ بری طرح بور ہو گئی تھی۔ جبکہ علی ہنس رہا تھا۔ وہ سر جھکا کر بیٹھی خود کو خاصا احمق محسوس کر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر کوئی اسے ہی دیکھے جا رہا ہے۔ آنٹی نے ایمن کو کولڈ ڈرنک لانے کے لیے کہا تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔
"تم دونوں میں سے بڑا کون ہے؟" انکل نے علی سے پوچھا تو وہ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔ ان کے برابر بیٹھے مرتضیٰ پر اتفاقاً ہی اس کی نگاہ پڑ گئی تھی۔ وہ چہرے پر شرارت سجائے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے تاثرات سے چڑ سی گئی تھی۔ علی انکل کی بات کے جواب میں بولا۔
"تانیہ بڑی ہیں۔"
"اچھا ویسے لگتا نہیں ہے۔ دیکھنے میں وہ تم سے چھوٹی لگتی ہے۔" ان کی بات پر اچانک ہی اسے ایک خیال سوجھا تو فوراً بولی۔
"علی مجھ سے پورے دس سال چھوٹا ہے۔"
سات سال کو اس نے دس سالوں میں بدل دیا تھا۔ تھوڑی بہت مبالغہ آرائی میں کوئی حرج نہیں۔ علی تو ویسے بھی اپنی ہائٹ اور جسامت کی وجہ سے چوبیس پچیس سے کم کا نہیں لگتا تھا۔ حالانکہ اس کی تیسویں سالگرہ اگلے مہینے ہے۔ چھبیس سالہ بھائی کی دس سال بڑی بہن یقیناً چھتیس سال کی ہوگی اور کسی چھتیس سالہ خاتون میں کسی کے لیے بھی کوئی اٹریکشن نہیں ہوتی۔ یہاں تو اپنے چھبیس سالہ بیٹوں کے لیے بھی اٹھارہ انیس سال کی لڑکی تلاش کی جاتی ہے تو چھتیس سال کی عمر میں اسے کون منہ لگائے گا۔ وہ بھی اپنے ذہین "قابل اور ہینڈسم بیٹے کے لیے" وہ اچانک بڑی پرسکون ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی جان بڑی عمدگی سے چھڑا لی تھی۔
"تو جی اب لاکھ سر پٹخو تمہاری اماں کبھی بھی تمہاری بات نہیں مانیں گی۔" وہ اپنی سوچ پر مسکرا دی تھی۔ ایمن کے کولڈ ڈرنک لانے پر اس کی سوچ کا سلسلہ ٹوٹا تھا۔ وہ اب کیونکہ بالکل پرسکون ہو گئی تھی اس لیے کچھ دیر پہلے والی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ پر بھی قابو پا چکی تھی۔
ایمن اپنے ساتھ ایک البم بھی لائی تھی۔ اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولی "میری انگیجمنٹ کی تصویریں ہیں۔" وہ اسے تصویریں دکھا رہی تھی۔ جبکہ تینوں مرد حضرات آپس میں گفت و شنید میں مصروف تھے۔ آنٹی اٹھ کر اندر چلی گئی تھیں۔ وہ تعریفیں کرتے ہوئے اس کی تمام تصویریں دیکھ رہی تھی۔
"علی اب چلیں۔" اس نے البم بند کرتے ہوئے

علی کو مخاطب کیا۔
"ایسے تو ہم تمہیں کبھی بھی نہیں جانے دیں گے۔ کھانے کا ٹائم ہو رہا ہے کھانا کھا کر جانا۔" علی سے پہلے انکل نے جواب دیا۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ آنٹی واپس آگئیں انہیں دیکھ کر انکل بولے۔
"بھئی وہ کھانے کا کیا ہوا؟"
"کھانا بالکل تیار ہے۔ بس سلاد رہ گئی ہے۔ جاؤ ایمن سلاد بنا کر۔" ایمن نے سلاد بنانے کے نام پر برا سا منہ بنایا تھا۔
"دیکھو ذرا اسے کتنی کام چور ہے۔" وہ تابعہ سے بولیں تو وہ مسکرا دی۔
"کوکنگ کا بالکل شوق نہیں ہے۔ میں کام کرنے کو کہوں تو کہتی ہے تو کس مرض کی دوا ہے۔" ایمن اپنی برائیوں پر ناراض ہو کر کچن میں چلی گئی تھی۔
"کوئی بات نہیں آنٹی آہستہ آہستہ سیکھ جائے گی۔ میں نے بہت سی لڑکیاں دیکھی ہیں جنہیں شادی سے پہلے کوکنگ کا بالکل شوق نہیں ہوتا مگر بعد میں وہ سب سیکھ جاتی ہیں۔" اس نے انہیں دلاسا دینے کی کوشش کی تھی۔
"امید تو یہی ہے۔" انہوں نے مایوسی سے سر ہلایا۔
"اور ہماری بیٹی کو کوکنگ کا کتنا شوق ہے؟" انکل نے جو اس کی اور آنٹی کی باتیں بغور سن رہے تھے پوچھا۔
"مجھے بھی کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ بس گزارا ہو جاتا ہے۔" اسے اپنی برائیاں کرنے میں بہت مزہ آ رہا تھا۔
"تمہیں ٹائم بھی کہاں ملتا ہو گا۔ ڈاکٹرز کی لائف تو کتنی بزی اور ٹف ہوتی ہے۔" آنٹی نے سنجیدگی سے کہا۔ علی اور مرتضیٰ اس تمام گفتگو میں خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔
"شوق ہو تو انسان ٹائم بھی نکال لیتا ہے اصل میں مجھے شوق ہی نہیں ہے۔" وہ چاہتی تھی کہ آج اس کے جانے کے بعد مرتضیٰ کی ماما جو بھی اس کے بارے میں سوچیں وہ کچھ یوں ہو "صرف ڈاکٹری کو لے کر بیٹھیں چاہتا ہے کیا۔ نہ گھر نہ سلیقہ مند اور اوپر سے عمر رسیدہ۔ نہ بابا مجھے منظور نہیں۔" یہاں سے واپسی میں وہ علی کو کیسے فیس کرے گی اس بات سے قطع نظر وہ اس وقت بہت خوش تھی۔ چہرے پر سے مسکراہٹ ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ملازم نے آ کر کھانا لگ جانے کی اطلاع دی تو وہ سب اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔
وہ اب بڑی پرسکون تھی اس لیے بغیر کسی گھبراہٹ یا ہچکچاہٹ کے کھانے کی میز پر آ گئی تھی۔ اس کے بالکل سامنے والی کرسی پر مرتضیٰ اور اس کے برابر میں علی بیٹھے ہوئے تھے۔ آنٹی اور انکل دونوں ہی اس کی خاطر مدارات میں لگے ہوئے تھے۔
"تابعہ تم یہ نرگسی کوفتے ضرور ٹرائی کرنا۔ میری یہ ڈش سب ہی لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔" تابعہ نے ان کے کہنے پر تھوڑا سا سالن اپنی پلیٹ میں ڈال لیا تھا۔
"لگتا ہے آنٹی آپ نے اپنے ہاں کک نہیں رکھا ہوا۔ کھانا آپ خود ہی پکاتی ہیں۔" اس کی بات پر انکل نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔
"اس معاملے میں یہ بہت وہمی ہیں۔ انہیں نوکروں کے ہاتھ کا پکا کھانا اصول صحت کے خلاف لگتا ہے۔ خود اپنے ہاتھ سے صاف ستھرے طریقے سے کھانا پکا کر ہی انہیں تسلی ہوتی ہے۔" وہ انکل اور آنٹی کی ذہنی سوچ کی اس مماثلت پر حیران تھی۔ مرتضیٰ کی خود پر مرکوز نگاہوں پر اسے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ کھانا کھانے کے دوران تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے وہ دیکھ رہا تھا۔
"ایمن تم کیا کر رہی ہو؟" صرف اس کی نظروں کے حصار سے نکلنے کے لیے وہ اپنے برابر بیٹھی ایمن سے بولی۔
"میں سول انجینئرنگ کر رہی ہوں۔ فائنل ایئر کا امتحان تو دے دیا ہے آج کل ہمارا پروجیکٹ چل رہا ہے۔" ایمن نے چاول اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"واہ بھئی زبردست۔ آپ دونوں بہن بھائی نے فیلڈز کا انتخاب تو خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے مرتضیٰ بلڈنگ ڈیزائن کریں گے اور ایمن ان کی ڈیزائن کردہ building پر عملی کام کریں گی۔"
"ہاں کنسٹرکشن R.C.C میں ہونی چاہیے یا steel structures میں یہ ایمن ڈیسائیڈ کرے گی۔ یعنی یہ کہ کسی آؤٹ سائیڈر کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ گھر کا انجینئر اور گھر کا آرکیٹیکٹ۔" ہنستے ہوئے براہ راست مرتضیٰ کی طرف دیکھ کر بولی تھی۔
"تمہارا کیا خیال ہے میں تمہارے دیکھنے پر نروس ہو جاؤں گی بالکل کسی سولہ سترہ سال کی لڑکی کی طرح۔" چیلنج کرتی نظروں سے مرتضیٰ کو دیکھ رہی تھی۔ "تابعہ شعیب کوئی عام لڑکی نہیں ہے جسے تم اپنے سامنے دیکھ کر... میں تمہارے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوں گی۔"
اس کی بات کو سب ہی نے بہت انجوائے کیا تھا۔ مرتضیٰ کے لیے بھی اور عجز کو پتا بھی نہیں تھا کہ آمنے سامنے بیٹھے دو افراد اس وقت ایک دوسرے پر برسر پیکار ہیں۔ مرتضیٰ نے اس کی مسکراتی آنکھوں کو اپنی مقناطیسی آنکھوں کی گرفت میں لیتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔
"اور اگر کسی وجہ سے بلڈنگ گر گئی تو ڈاکٹر بھی تو گھر کا ہو گا۔" مرتضیٰ کے جواب پر انکل سمیت سب بے اختیار ہنس پڑے تھے اور اسے پتا نہیں کیا ہوا وہ ان نظروں کا سامنا نہیں کر پائی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا اس کے لیے دنیا کا مشکل ترین کام ثابت ہوا تھا۔ اس نے بے اختیار اپنی آنکھیں جھکا لی تھیں۔ اتنی دیر سے سنجیدہ بیٹھے مرتضیٰ کے لبوں پر ایک دم مسکراہٹ آ گئی تھی۔
"مجھے چیلنج قبول کرنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ آسان کام تو آج تک میں نے کوئی کیا ہی نہیں۔" اس کے چہرے پر موجود یہ تحریر وہ سر جھکائے ہوئے بھی پڑھ چکی تھی۔
علی کھانے کے دوران زیادہ وقت خاموش ہی رہا تھا۔ خوشگوار ماحول میں کھانا ختم ہوا تو اس نے علی سے گھر چلنے کا کہا۔ اسے ایک منٹ رکنے کا کہہ کر آنٹی اندر چلی گئیں وہ لوگ کھڑے ہوئے ان کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ دو تین منٹ بعد وہ واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں ایک بڑا سا ڈبہ تھا۔
"یہ تمہارے لیے۔" انہوں نے وہ ڈبہ اس کی طرف بڑھایا تو وہ بڑے جھجکتے ہوئے انداز میں بولی۔
"آنٹی پلیز آپ اس تکلف کو رہنے دیں۔" وہ ان سے کسی بھی قسم کا تحفہ قبول کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔
"تم پہلی بار ہمارے گھر آئی ہو اور میں تمہیں خالی ہاتھ جانے دوں اور یہ کوئی ایسی قیمتی چیز بھی نہیں ہے۔ بازار گئی تو یہ شال اچھی لگ گئی تھی میں نے ایسے ہی خرید لی تھی۔ شاید یہ تمہارے ہی لیے لی گئی تھی اور دیکھنا یہ بلیک کلر تمہیں کتنا سوٹ کرے گا۔"
انہوں نے ڈبہ کھول کر اسے شال دکھائی۔ بلیک کلر کی شال جس پر سرخ اور زرد رنگ سے کشمیری کڑھائی ہوئی تھی۔ اسے بغیر ہاتھ میں لیے بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کتنی قیمتی ہے۔ اسے تحفہ قبول کرنے میں متامل دیکھ کر انکل نے بھی اصرار کیا تو اس نے ایک نظر علی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ اسے اشارے سے گفٹ لینے کے لیے کہہ رہا تھا۔ مجبوراً اس نے شکریہ کے ساتھ ان کا تحفہ قبول کر لیا۔ وہ سب لوگ انہیں باہر تک چھوڑنے آئے تھے۔
"آنٹی آپ ایمن کو لے کر ہمارے گھر آئیے گا۔" اس نے پرخلوص انداز میں انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی تو وہ چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ لیے بولیں۔
"تمہارے گھر تو تم نہ بھی بلاتیں ہم نے تب بھی آنا ہی تھا۔" ان کی بات پر اس کا چہرہ ایک لمحے کو سرخ ہو گیا تھا۔ اگلے ہی پل وہ خود کو نارمل کر چکی تھی۔ مگر باقی تمام افراد کے چہروں پر دبی دبی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس سے زیادہ مشکل صورت حال کا سامنا اسے

آج تک کی زندگی میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ خود کو انجان اور لاتعلق ظاہر کرنا چاہ رہی تھی مگر کر نہیں پا رہی تھی۔ آنٹی اور انکل دونوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے دعائیں دیتے ہوئے رخصت کیا۔ سامنے کھڑے مسکراتے ہوئے مرتضیٰ کی موجودگی اس کے اس پر بڑی بھاری پڑ رہی تھی۔

راستے میں وہ علی سے نظریں چرائے روڈ کی طرف توجہ سے آتی جاتی گاڑیوں کا معائنہ کرتی رہی تھی۔ اسے اپنے چھوٹے بھائی کے سامنے اس وقت بڑی سخت شرمندگی ہو رہی تھی۔ آخر وہ کوئی چھوٹا سا بچہ تو نہیں تھا جو کوئی بات سمجھ نہ سکتا ہو۔ اپنی اس شرمندگی اور جھجک کو مٹانے کے لیے وہ علی سے ایمن کے متعلق پوچھنے لگی۔

"علی تم ایمن کو کیسے جانتے ہو؟" وہ جو بڑی توجہ سے ڈرائیونگ کر رہا تھا ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ ونڈ اسکرین پر نظریں جما کر بولا۔

"وہ اکثر آفس آتی ہے اپنے پروجیکٹ کے سلسلے میں مدد لینے اور زیادہ تر مجھ بے چارے ہی کی شامت آتی ہے کہ اسے اور اس کے گروپ کے باقی لوگوں کو گائیڈ کروں۔"

وہ جواب دینے کے بعد اس کی طرف دیکھ کر بولا "لیکن آپ کیوں پوچھ رہی تھیں؟"

"بس ایسے ہی۔ تم لوگوں کے بات کرنے کے اسٹائل سے لگ رہا تھا کہ بہت اچھی دوستی ہے۔" وہ لاپروائی سے بولی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ ان دنوں عجیب سی الجھن کا شکار تھی۔ سارا دن خود کو کام میں دانستہ مصروف رکھ کر وہ جب رات کو تھک ہار کر بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرتی تو بند آنکھوں کے سامنے کسی کی مسکراتی ہوئی شبیہ جانے آجاتی۔ کسی کی مقناطیسی آنکھیں اسے اپنی گرفت میں لیتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ وہ جتنا اس خیال سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتی وہ اتنی ہی آن بان سے سامنے آکھڑا ہوتا۔ وہ [illegible] علی کبھی اور کسی کے لیے بھی نہیں کھولنا چاہتی تھی مگر وہ اس قلعے کا محاصرہ کیے اس طرح کھڑا تھا کہ وہ اپنے بچاؤ کی ہر ممکن کوشش کرنے کے باوجود خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔

"پلیز مجھے ڈسٹرب مت کرو۔ میں بڑی سیدھی سادی اور پرسکون زندگی گزار رہی ہوں میرے اس سکون کو درہم برہم مت کرو۔" وہ اس کے تصور سے التجا کرتی۔

مرتضیٰ آفس کے کسی کام سے علی کو اسلام آباد بھیج رہا تھا۔ جس صبح علی جا رہا تھا وہ پتا نہیں کیوں اس روز بڑی اداس تھی۔ اپنی یہ بے کلی اور اداسی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ علی کو روک لے اسے نہ جانے دے۔ مگر وہ اسے کیا کہہ کر روکتی یہ سوچ کر وہ چپ ہو گئی تھی۔

"بجی میں صرف تین دن کے لیے جا رہا ہوں۔ آپ تو اس طرح فکرمند ہو رہی ہیں جیسے میں سالوں کے لیے کہیں جا رہا ہوں۔" وہ اس کی مسلسل نصیحتوں سے عاجز آکر بولا تھا۔ علی کے اوپر بہت سی قرآنی سورتیں پھونک کر اس نے اسے رخصت کیا تھا۔

اس روز ہاسپٹل میں بھی اس کا دل نہیں لگا تھا۔ سارا دن عجیب سی الجھن میں گزر گیا تھا۔ وہ اپنے اندر کو جتنا جھٹک کر خود کو پرسکون کرنا چاہتی اتنا ہی اس کا دل اداسی میں ڈوبتا چلا جاتا۔ رات میں کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے وہ اور پاپا ٹی وی پر اپنی پسندیدہ مووی دیکھ رہے تھے۔

"پاپا دیکھیں یہ سین میں نے آپ سے کہا تھا کتنا زبردست پکچرائز کیا ہے۔ ڈائریکٹر کی ذہانت کا پتا چلتا ہے۔" وہ اسکرین پر نظریں جمائے پاپا سے بولی۔ انہوں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو اس نے نظریں گھما کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ ہونٹ بھینچے ہاتھ رکھے انتہائی اذیت میں نظر آ رہے تھے۔ اس کے دیکھتے دیکھتے چائے کا کپ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر کارپٹ پر گر گیا تھا۔

"پاپا!" وہ چیخی تھی۔ "پاپا کیا ہوا ہے آپ کو۔" وہ پاپا کا ہاتھ پکڑ کر روہانسی آواز میں بولی۔ اسے جواب دینے کی کوشش میں اپنے لب وا کرتے وہ صوفے پر گر گئے تھے۔ بے ہوش پڑے پاپا کو دیکھ کر اس کے اوسان ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ ان کے پاس بیٹھ کر ان کی ہارٹ بیٹ چیک کر کے وہ انہیں فرسٹ ایڈ دینا چاہتی تھی مگر اس کے اوسان ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ کانپتے ہوئے بازوؤں میں بالکل بھی سکت نہیں تھی۔ وہ پوری کی پوری کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں کا کفن میں لپٹا چہرہ آ رہا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھی اس کی سوچنے سمجھنے کی تمام حسیات اس کا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھیں۔ انور تو رات نو بجے ہی جا چکا تھا۔ وہ کہاں سے مدد لے۔ وہ بغیر کچھ سوچے بھاگتی ہوئی علی کے کمرے میں گئی تھی اور اس کے ٹیلی فون انڈیکس میں سے ایک نمبر نکال کر اب کانپتے ہاتھوں سے فون ملا رہی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ بیڈ پر نیم دراز کتاب پڑھتے ہوئے اپنا فیورٹ [illegible] سن رہا تھا۔ موبائل کی بیل بجی تو اس نے نظر گھڑی کی طرف ڈالی اور سوچا کہ رات کے اس وقت کون ہو سکتا ہے۔

"ہیلو!" تیسری چوتھی بیل پر اس نے کال ریسیو کی تھی۔

"ہیلو مرتضیٰ میں تانیہ۔" دوسری طرف سے آتی آواز سن کر وہ چونک گیا تھا۔ عجیب گھبرایا ہوا سا لہجہ تھا اس کا۔

"کیا بات ہے تانیہ؟ آپ ٹھیک ہیں؟" اس کی حسیات اسے کسی خطرے کی نشان دہی کر رہی تھیں۔

"آپ پلیز جلدی سے آجائیں۔ پاپا کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی تھی۔ اس کے رونے [illegible] ہوا وہ ایک دم بستر سے اتر گیا تھا۔

"آپ روئیں مت میں آ رہا ہوں۔" اسے دلاسا دے کر اس نے فون بند کیا تھا اور گاڑی کی چابیاں اٹھا کر سیڑھیاں اترتا نیچے آگیا تھا۔

لاؤنج میں ایمن ٹی وی دیکھ رہی تھی "ایمن میں علی کے گھر جا رہا ہوں۔ اس کے پاپا کی طبیعت خراب ہے۔" اسے اطلاع دے کر وہ باہر نکل گیا تھا۔

اس سے زیادہ تیز رفتاری سے گاڑی اس نے زندگی میں کبھی نہیں چلائی تھی۔ رات کا وقت ہونے کی وجہ سے ٹریفک بھی کم تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ان کے گھر پہنچ گیا تھا۔ گاڑی باہر ہی چھوڑ کر وہ اندر آگیا تھا۔ گیٹ کھلنے کی آواز سن کر وہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی باہر نکلی تھی۔ وہ چوکیدار سے اسے بلانے کا کہہ ہی رہا تھا جب وہ اس کے پاس آگئی تھی۔

"مرتضیٰ پلیز میرے پاپا کو بچا لیں۔" وہ آنکھوں میں خوف و ہراس لیے اس سے بولی تو وہ اسے کوئی جواب دیے بغیر خود ہی اندر آگیا۔ لاؤنج میں صوفے پر بے ہوش پڑے انکل کو دیکھ کر وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھا تھا۔ وہ دور کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ انہیں اپنے بازوؤں پر اٹھا کر وہ تیزی سے باہر نکلا تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہوئی باہر آگئی تھی۔ انہیں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر احتیاط سے لٹا کر وہ اس سے بولا "بیٹھیں" وہ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کر کے وہ انہیں جلد از جلد قریب ترین ہاسپٹل پہنچا دینا چاہتا تھا۔ اسے مسلسل آنسو بہاتا دیکھ کر وہ نرمی سے بولا تھا۔

"آپ تو ایک ڈاکٹر ہیں آپ کو اپنے اعصاب پر کنٹرول رکھنا چاہیے۔" اس نے شاید اس کی آواز ہی نہیں سنی تھی وہ گردن موڑے پاپا کو دیکھتے ہوئے روئے جا رہی تھی۔ گاڑی ہاسپٹل کے احاطے میں روک کر وہ اندر چلا گیا تھا۔ اسٹریچر پر لٹا کر انہیں آئی سی یو میں پہنچا دیا گیا تھا۔ مرتضیٰ ادھر ادھر نہیں کیا بھاگ دوڑ کرتا پھر رہا تھا۔ وہ اکیلی اس ٹھنڈے بنچ اور خاموش کوریڈور میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ کافی دیر بعد مرتضیٰ اس کے پاس آیا۔ وہ اسے اپنے پاس آتا دیکھ کر بے اختیار رو دی۔ [illegible] تھوڑی دور بیٹھ گئی تھی۔

"مجھے کوئی بری خبر مت سنائیے گا۔" وہ وحشت زدہ انداز میں چیخی تھی۔

"تائبہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ انکل ٹھیک ہیں۔ بس انہیں فوراً طبی امداد بھی مل گئی ہے خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ اسے رسانیت سے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"میرے دل کو اطمینان نہیں ہو تا۔ ایسے ہی ممی بھی مجھے چھوڑ گئی تھیں میں نے انہیں کتنی آوازیں دیں کتنا بلایا تھا مگر انہوں نے میری کوئی بات نہیں سنی تھی۔" وہ اس وقت ایک ڈاکٹر نہیں بلکہ ایک سات آٹھ سال کی بچی بن گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا ممی ابھی ابھی اسے چھوڑ کر گئی ہیں۔ مرتضیٰ نے ایک نظر اس کے روتے سسکتے وجود پر ڈالی اور خود کو عجیب سی الجھن میں گھرا پایا۔ ان آنکھوں میں آنسو اس نے کبھی بھی نہیں دیکھنے چاہے تھے۔

علی نے ایک بار اس سے کہا تھا "مرتضیٰ بھائی میری بہن بہت حساس ہے۔ وہ آج تک ممی کا صدمہ نہیں بھولی اسے کبھی کوئی دکھ مت دیجیے گا" اور اس نے علی سے وعدہ کر لیا تھا۔

"آئیں وہاں بینچ پر بیٹھ جائیں۔" مرتضیٰ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ وہ یونہی کھڑی روتی رہی تو اس نے خود ہی پکڑ کر اسے بینچ پر بٹھا دیا اور خود بھی اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"آپ اللہ سے دعا کریں۔ دعا میں بہت طاقت ہوتی ہے۔" اس نے نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ تو وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"میرے بھائی کو بلا دیں۔ پلیز میرے علی کو بلا دیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر التجا کر رہی تھی۔

"ابھی رات کو اسے پریشان کرنا صحیح نہیں ہے۔ میں صبح اسے کال کر دوں گا۔" وہ تسلی دینے والے انداز میں بولا۔

"چاہے تب تک میرے پاپا کو کچھ بھی ہو جائے۔" وہ روتے ہوئے جذباتی انداز میں چیخی۔ "علی تم کہاں ہو دیکھو پاپا بھی ممی کی طرح ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔"

مرتضیٰ سے اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا [illegible] چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔

"تائبہ ہوش میں آئیں۔" مرتضیٰ نے اسے جھنجھوڑا تھا۔ وہ ایک دم چپ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ "آپ کو میری بات پر اعتبار ہے؟"

اس نے بے اختیاری میں گردن ہلا دی تھی۔

"پھر میں آپ کو یقین دلا رہا ہوں کہ انکل کو کچھ نہیں ہو گا۔ وہ ان شاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

اگلے پل وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر رو رہی تھی۔ مگر اب صرف اس کی آنکھوں سے اشک بہہ رہے تھے۔ چیخنا چلانا ختم ہو چکا تھا۔ مرتضیٰ نے اسے روکنے کے بجائے رونے دیا تھا۔ بہت دیر رونے کے بعد جب صرف اس کی سسکیوں کی آوازیں باقی رہ گئیں تو مرتضیٰ نے اس کا سر اپنے کندھے پر سے ہٹایا اور بولا "پانی پینا ہے؟" اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے رگڑ رگڑ کر آنسو صاف کرنے کے بعد سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ مرتضیٰ نے ایک نظر اس پر ڈالی اور اٹھ کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔

"لیں پانی پی لیں۔" اس نے خاموشی سے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور پانی پینے لگی۔ وہ دوبارہ اس کے برابر میں بیٹھ گیا تھا۔

"کب سے خراب تھی انکل کی طبیعت؟" اس کے سوال پر تائبہ نے جواب دیا تھا۔

"پاپا کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ ہم دونوں تو ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ جب [illegible]" اس کے حلق میں [illegible] لگا تھا اپنی بات ادھوری چھوڑ کر وہ اپنے آنسو روکنے کی سعی کرنے لگی۔ جتنا وہ آنسوؤں کو دھکیل رہی تھی اتنا ہی وہ بہے جا رہے تھے۔ مرتضیٰ نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو خشک کیے اور بولا "اب نہیں رونا۔"

وہ اس کی بات پر چپ سی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

"شاباش Thats like a good girl" مرتضیٰ نے اسے چپ کروانے کی کوشش کی [illegible]

"آپ تو بہت ہی نالائق ڈاکٹر ہیں۔ جب میری ڈیزائننگ کی ہوئی بلڈنگ گرے گی تو میں کم از کم آپ سے تو یہ امید نہیں رکھ سکتا کہ آپ زخمیوں کا علاج کر سکیں گی۔ ویسے سچ سچ بتائیں آپ واقعی ڈاکٹر ہیں بھی یا نہیں۔ اب تو مجھے اس بات کی تصدیق کے لیے ڈگری دیکھنی پڑے گی۔" وہ بڑی شگفتگی سے ہنستے ہوئے بولا تو اس کی بات پر تائبہ کے چہرے پر بھی ایک لمحے کو ہلکی سی مسکراہٹ آئی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آتے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔

"مرتضیٰ پاپا ٹھیک ہو جائیں گے ناں؟" اس نے دوبارہ تصدیق چاہی۔

"ہاں ان شاء اللہ۔" اس نے جواب میں یقین دلایا تھا۔

صبح چھ بجے کے قریب ڈاکٹر نے انہیں خوش خبری سنائی کہ پاپا کی حالت خطرے سے باہر ہے اور انہیں پرائیوٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ کمرے میں آ کر دواؤں کے زیر اثر بے خبر سوئے پاپا کو دیکھ کر اس کی آنکھوں سے دوبارہ برسات ہونے لگی تھی۔

"میرے خیال سے یہ وقت خدا کا شکر ادا کرنے کا ہے نا کہ بیٹھ کر رونے کا۔" مرتضیٰ نے پاپا کے بیڈ کے پاس ہی رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے ٹوکا تو وہ خود کو سرزنش کرتی وضو کرنے چلی گئی۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے پاپا کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اسے ایک دو بار خیال آیا بھی کہ اس کی وجہ سے مرتضیٰ ساری رات تھکا ہے اور اب اسے گھر جانے کے لیے کہہ دینا چاہیے۔ مگر وہ ایسا کہہ نہیں پائی اس کے ہونے سے ایک ڈھارس سی بندھی ہوئی تھی کہ اگر یہ ہے تو کوئی فکر کی بات نہیں۔

اسے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے بے شمار رشتے داروں، ملنے والوں اور دوستوں میں سے کسی سے مدد مانگنے کے بجائے آخر اس نے مرتضیٰ کو کیوں بلایا تھا۔ اس سے تو آج تک وہ کبھی ڈھنگ سے ملی بھی نہیں تھی۔ مصیبت کے وقت تو انسان اسے پکارتا ہے جس پر اسے سب سے زیادہ بھروسہ ہو گیا وہ مرتضیٰ پر سب سے زیادہ بھروسہ کرتی تھی؟ اسے لگا جس قلعے کے فتح ہو جانے کا ڈر اسے ہر وقت رہتا تھا کہ کہیں وہ اس قلعے کے دروازے کھول کر اندر نہ آ جائے اس کے دروازے تو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے مرتضیٰ کے لیے کھول دیے تھے۔ وہ بغیر کسی جنگ کے ہی جیت گیا تھا۔ وہ آیا اس نے دیکھا اور فتح کر لیا شاید مرتضیٰ ہی کے لیے کہا گیا تھا۔

ساڑھے آٹھ بجے پاپا کو ہوش آیا تھا۔ وہ بے اختیار ان کی طرف بڑھی تھی۔

"پاپا آپ ٹھیک ہیں ناں؟ پاپا آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" وہ بیڈ پر بیٹھ کر پاپا کا ہاتھ تھام کر پوچھ رہی تھی۔ جواب میں پاپا نے نقاہت سے بھرپور آواز میں کہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں میری جان۔" ایک مرتبہ پھر آنکھوں سے آنسو رواں ہونے کے لیے تیار تھے۔ اسے رونے کے لیے آمادہ دیکھ کر پیچھے کھڑا مرتضیٰ اس کے کان میں بولا تھا۔

"خبردار رونا مت۔ انکل کی طبیعت تمہیں روتا دیکھ کر دوبارہ خراب ہو جائے گی۔" اس کی دھمکی نما نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اس نے جلدی سے خود کو نارمل کیا۔ اسے سنبھلنے کا موقع دینے کے لیے مرتضیٰ آگے بڑھ کر انکل کی خیریت دریافت کرنے لگا تھا۔ ڈاکٹر نے آ کر ان کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد تسلی بخش جواب دیا تو وہ اور بھی پرسکون ہو گئی۔ ایک بہت ہی کڑی مصیبت کی رات گزر چکی تھی۔ وہ خدا کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا۔

"انکل کی طبیعت اب بہتر ہے۔ چلیں گھر چل کر فریش ہوں ناشتا کریں اور انکل کے لیے بھی کچھ کھانے کے لیے لائیں۔" مرتضیٰ کی بات کی پاپا نے بھی بڑی کمزور اور نحیف آواز میں تائید کی تھی۔ اسے اپنے آپ سے زیادہ پاپا کا خیال تھا ان کے لیے ناشتا بنانے کی خاطر وہ گھر جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

مرتضیٰ کے برابر گاڑی میں بیٹھی وہ ابھی بھی رات کا ہولناک منظر یاد کر رہی تھی۔ "اگر مرتضیٰ فوراً نہیں آ جاتا تو پتا نہیں کیا ہوتا۔" وہ دہل رہی تھی۔ گاڑی گھر

کے سامنے رکی تو وہ اس سے کہنے لگی۔
"ڈرائیور آ گیا ہو گا، میں پاپا کے لیے ناشتا اس کے ساتھ لے جاؤں گی۔" وہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ جمائے کچھ براماں ہو کر بولا۔
"یعنی یہ کہ مجھے اب چلے جانا چاہیے۔"
"نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ آپ کو میری وجہ سے اتنی زحمت اٹھانی پڑی۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں اتار سکتی۔ میں تو صرف اس خیال سے کہہ رہی تھی کہ آپ رات بھر جاگ کر تھک گئے ہوں گے آپ کو ریسٹ کرنا چاہیے۔" وہ وضاحت کرنے لگی تھی۔
"صاف کہو تمہارا ارادہ مجھے ناشتا کرانے کا نہیں ہے بہانے بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اس کے "تم" پر حیران رہ گئی تھی۔ وہ کتنی بے تکلفی سے اس سے بات کر رہا تھا اور جس بات پر اسے زیادہ حیرت ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ اس کی بے تکلفی اسے بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان ذہین آنکھوں سے تو وہ ہمیشہ ہی خائف رہی تھی اس لیے فوراً گاڑی سے اتر گئی تھی۔

وہ بھی گاڑی کا دروازہ بند کرتا اس کے ساتھ ہی اندر آ گیا تھا۔ مرتضیٰ کو لاؤنج میں بٹھا کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور واپس نیچے آ گئی۔ وہ صوفے پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر اخبار ایک طرف رکھتا ہوا بولا۔

"صرف پانچ منٹ میں کسی خاتون کو تیار ہوتے پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔" وہ اس بات پر دھیمے سروں میں ہنس پڑی اور بولی۔
"آپ ناشتے میں کیا لیں گے؟" وہ اس کی خاطر اتنا خوار ہوا تھا تو اس کا بھی فرض بنتا تھا کہ اس کی اچھی طرح خاطر مدارات کرے۔
"کیا میں یہ امید رکھ سکتا ہوں کہ یہ جملہ میں آئندہ بھی بے شمار مرتبہ آپ کے منہ سے سنوں گا؟" وہ بڑی سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس بات پر بری طرح بوکھلا گئی تھی۔ اپنی نروس اور گھبرائی ہوئی حالت سے چھٹکارا پانے میں اسے ایک دو سیکنڈ لگے تھے۔ وہ گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"آپ نے جواب نہیں دیا۔ کیا لیں گے؟" وہ خود کو سنبھال کر دانستہ اس کی بات نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
"آپ نے بھی تو جواب نہیں دیا۔" وہ برجستہ بولا تھا۔ فون کی بیل نے اسے اس مصیبت سے نجات دلا دی تھی۔ وہ فوراً فون سننے لگی تھی۔ دوسری طرف علی کی آواز سن کر وہ بے اختیار ہو گئی تھی۔
"او علی تم! جلدی سے واپس آ جاؤ پاپا کی..." مرتضیٰ نے اس کے ہاتھ سے ریسیور جھپٹ لیا تھا اور اسے گھورتا ہوا خود علی سے بات کرنے لگا تھا۔ ساری بات تفصیل سے مناسب الفاظ میں اس طرح بتائی کہ وہ پریشان نہ ہو۔ وہ اسے بات کرتا دیکھ کر کچن میں چلی گئی تھی۔ پھر اس نے مرتضیٰ نے ناشتا کیا اور پاپا کے لیے ناشتا لے کر وہ مرتضیٰ کے ساتھ ہاسپٹل چلی گئی۔ اسے چھوڑ کر مرتضیٰ چلا گیا تھا۔
پہلی فلائیٹ سے علی واپس آ گیا تھا اور آتے ہی سیدھا ہاسپٹل چلا آیا۔ علی کے آتے ہی وہ بالکل پرسکون ہو گئی۔ ہر طرح کی فکر پریشانی اور سوچ سے آزاد وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ وہ عمر میں اس سے چھوٹا سہی پر تھا تو ایک مرد۔ مضبوط اعصاب کا مالک ہر طرح کے حالات میں ہمت اور شجاعت سے کام لینے والا۔ اس نے آتے ہی اسے اور پاپا کو سنبھال لیا تھا۔ پاپا کو ان کے اپنے ہاسپٹل میں منتقل کروا کر اس نے بڑے بڑے قابل ڈاکٹرز کا پاپا کے گرد جمگھٹا لگا دیا تھا۔
وہ علی کے گلے لگ کر بہت روئی تھی۔ "علی اگر پاپا کو کچھ ہو جاتا میں تو اسی لمحے مر جاتی۔" وہ اسے اپنے بازوؤں میں چھپائے دلاسے دے رہا تھا۔ اس لمحے اسے احساس ہوا تھا کہ علی کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ اب علی کو اس کی پناہ کی ضرورت نہیں بلکہ اسے علی کی پناہ

چاہیے۔ وہ اس کا مان تھا اس کا فخر اور غرور۔ اس کے ہاتھ میں پلا وہ اب اس قابل ہو گیا تھا کہ اس کی اور پاپا کی دیکھ بھال کر سکے۔ جن کے جوان بھائی موجود ہوں ان بہنوں کو کبھی بھی فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے خود سے کہا تھا۔

شام میں مرتضیٰ اپنے ماما اور ڈیڈی کے ساتھ آیا تھا۔ پاپا کی حالت اب بہت بہتر تھی۔ وہ بیڈ پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ وہ علی اور پاپا کو مرتضیٰ کے ان کے گھر رات آنے اور پھر ساری رات ہاسپٹل میں رہنے کے بارے میں بتا چکی تھی اس لیے پاپا اس کا اور اس کے والدین کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ جتنی دیر وہ لوگ وہاں رہے وہ کچھ کترائی کترائی چپ بیٹھی رہی۔ مرتضیٰ کی طرف دیکھنے کی تو اس میں ہمت ہی نہیں تھی۔ کتنی آسانی سے ان دونوں کے بیچ موجود اجنبیت کی دیوار گر گئی تھی۔ وہ ابھی تک حیران تھی کہ یہ ہوا کیا ہے؟

پاپا تین دن ہاسپٹل میں رہے تھے۔ چوتھے روز ان کو ڈسچارج کیا گیا تو انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ مریض بننا کتنا مشکل ہے اس بات کا اندازہ انہیں ان تین چار دنوں میں ہوا تھا۔ علی جب سے واپس آیا تھا آفس نہیں گیا تھا اور مرتضیٰ بھی اس روز کے بعد دوبارہ نہیں آیا تھا۔

نائبہ نے ایک دو بار اس کے بارے میں سوچا کہ وہ آیا کیوں نہیں؟ شام میں وہ اور علی لان میں گھاس پر بیٹھے Hang man کھیل رہے تھے۔ بچپن میں وہ دونوں یہ گیم بہت کھیلا کرتے تھے۔ آج اچانک علی کو بچپنا سوجھا تھا اور وہ لوگ کھیلنے لگے تھے۔ پاپا اپنے کمرے میں سو رہے تھے۔

لان کی طرف آتے مرتضیٰ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر قوس و قزح کے تمام ہی رنگ بکھر گئے تھے۔ کیا کسی ایک آدمی کی موجودگی یا غیر موجودگی اتنے معنی بھی رکھ سکتی ہے؟ اس نے خود سے پوچھا تھا۔ وہ اس کے چہرے پر پھیلے رنگوں کو دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی؟" مرتضیٰ ان دونوں کے پاس ہی گھاس پر بیٹھ گیا تھا۔

"Hang man کھیل رہے ہیں ہم لوگ آپ بھی ہمارا گیم انجوائے کریں۔ بس میں جیتنے ہی والا ہوں" علی نے مرتضیٰ سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بچپن میں ہم بہن بھائی بھی بہت کھیلا کرتے تھے۔" مرتضیٰ نے نائبہ اور علی کے درمیان گھاس پر رکھے پیپر کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"بس بری اب میرا خیال ہے وہ ذرا ـــــــ کر دیجیے۔ غلطی کی تو اب ویسے بھی آپ کے پاس کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بے چارہ Man تقریباً hang ہو ہی چکا ہے۔" علی نے چنے منہ میں ڈالے۔ کچھ سوچتی ہوئی نائبہ سے کہا تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

"V بولو" مرتضیٰ نے نائبہ سے کہا۔

"مروائیں گے مجھے" وہ اس کی طرف دیکھے بنا پیپر پر نظریں جمائے بولی۔

"مرتضیٰ بھائی ہم دونوں کی شرط لگی ہے اگر یہ ہار گئیں تو مجھے آئس کریم کھلائیں گی اور اگر جیت گئیں تو میں کھلاؤں گا" علی نے اسے اپنی شرط سے آگاہ کیا۔

"تم V بولو تو سہی۔ اگر ہار گئیں تو آئس کریم دونوں کو میں کھلاؤں گا۔" مرتضیٰ نے اسے اکسایا تو وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی "کیا آپ کی سمجھ میں آ گیا ہے کہ علی نے کیا لفظ پوچھا ہے؟"

"ہاں Vowels تو تم پہلے ہی فائل کرا چکی ہو۔ اسے دیکھ کر ہی سمجھ میں آ رہا ہے کہ کیا لفظ ہے۔" علی ان دونوں کی بے تکلف گفتگو کو بہت تعجب سے سن رہا تھا۔

"اچھا علی V لکھو" اس کی بات مان کر وہ بولی اور علی نے سب سے پہلے Blank میں "V" لکھ دیا۔

"مرتضیٰ بھائی ویسے یہ فاؤل ہے۔ آپ اب اور کوئی لفظ نہیں بتائیں گے۔" وہ مصنوعی خفگی طاری کر کے بولا تھا ورنہ دل تو اس وقت بھنگڑا ڈالنے کو چاہ رہا تھا۔ کوئی خوشگوار تبدیلی آ چکی ہے یہ بات تو اس نے آتے ہی محسوس کر لی تھی۔ مگر اتنی زیادہ کا اسے اندازہ

نہیں تھا۔ تو مرتضیٰ بھائی آخر کار آپ یہ معرکہ جیت ہی گئے۔ وہ دل ہی دل میں مسکرایا تھا وہ علی کی سوچوں سے بے نیاز یہ سوچنے میں لگی ہوئی تھی کہ باقی چار خانوں میں کون سے الفاظ آئیں گے۔

"T بولو" مرتضیٰ علی کی ناراضگی کو خاطر میں لائے بغیر دوبارہ بولا تو وہ احتجاجاً چیخ اٹھا۔

"نہیں اس میں فاؤل کیا ہے۔ گیم کے رولز اینڈ ریگولیشنز میں یہ کہاں طے پایا تھا کہ کسی سے مدد نہیں لے سکتے۔" وہ خفگی سے بولی۔

"چلو T لکھو" وہ علی کو دیکھ کر ہنستے ہوئے بولی۔ اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے دو خانوں میں "T" لکھ دیا تو وہ خوش ہو کر بولی "میری سمجھ میں آ گیا ہے اب آخری لفظ آپ مت بتائیے گا۔"

"بڑی جلدی سمجھ میں آ گیا" علی نے طنزیہ انداز اختیار کیا۔

"P" وہ پر یقین سے بولی اور مرتضیٰ اس کی خوشی سے دمکتی شکل دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔

"بڑا کمال کیا۔ ساری مدد تو مرتضیٰ بھائی نے کی ہے۔" علی نے "P" بھی لکھ دیا لفظ Vituperte مکمل ہو چکا تھا۔ وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔

"پیسوں کا انتظام کر لو میں بہت ساری آئس کریم کھاؤں گی۔" وہ اسے چڑاتے ہوئے بولی تو مرتضیٰ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"انکل کہاں ہیں؟" اسے اپنی آمد کا مقصد یاد آیا تو انکل کے بارے میں پوچھا۔

"پاپا کی آنکھ لگ گئی ہے۔ اپنے کمرے میں ہیں۔" علی نے جواب دیا۔

"ہاں میں انکل کی طبیعت ہی پوچھنے آیا تھا۔ دو تین دن سے آنا ہی نہیں ہوا۔" وہ ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر کچن میں چلی گئی۔ چکن اور چیز کے سینڈوچز اور چائے ٹرے میں رکھ کر وہ واپس لان میں آئی تو مرتضیٰ علی سے کہہ رہا تھا۔

"The word 'no' has no exiztance for me" جب میں کسی کام کا ارادہ کر لیتا ہوں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت مجھے پیچھے ہٹنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔" علی اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اسے آتا دیکھ کر چپ ہو گیا۔ وہ ان دونوں کے سامنے ٹرے رکھ کر خود بھی سامنے ہی بیٹھ گئی۔

"واہ میرے فیورٹ چیز سینڈوچز۔" علی نے خوشی سے نعرہ لگایا اور جلدی سے اپنی پلیٹ میں سینڈوچ رکھ کر کھانے لگا۔

"آپ بھی لیں۔" نائبہ نے پلیٹ مرتضیٰ کے ہاتھ میں پکڑائی۔ تو اس نے بھی سینڈوچ لے لیا۔

"علی ایک بات پوچھوں؟" مرتضیٰ نے ڈرامائی انداز میں علی کو مخاطب کیا۔

"جی پوچھیں؟" علی نے کھانے کے دوران جواب دینے کی فرصت نکالی۔ نائبہ چائے کا کپ ہاتھ میں لیے ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

"کیا نائبہ واقعی ڈاکٹر ہے؟" وہ اس کی شرارتی مسکراہٹ سے ہی سمجھ گئی تھی کہ بات اسی سے متعلق ہے۔

"کیوں آپ کو کوئی شک ہے؟" علی کے پوچھنے پر وہ بڑی صاف گوئی سے بولا۔

"صرف شک مجھے تو یہ بات سو فیصدی جھوٹ معلوم ہوتی ہے کہ یہ ڈاکٹر ہے۔ میں یا تم کم از کم کسی زخمی کی مرہم پٹی وغیرہ تو کر ہی لیتے ہیں۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ اپنے مریضوں کا علاج کیسے کرتی ہو گی۔" اس کی بات پر علی کا قہقہہ بے ساختہ تھا جبکہ وہ منہ بنائے خاموش بیٹھی تھی۔

"آپ کو کیا پتا ہمارے گھر میں کیسے کیسے سین ہوتے ہیں۔ یہ تو پھر بھی پاپا کا معاملہ تھا اور اپنے ماں باپ کے لیے تو ہر کوئی اموشنل ہوتا ہے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ کسی مریض کی ڈیتھ ہو جائے تو اس دن کھانا نہیں کھایا جائے گا کمرہ بند کر کے خوب رونا دھونا مچے گا۔"

"علی!" وہ اس کی باتوں پر چڑ کر تنبیہی انداز میں بولی تھی۔

"لیکن یہ ٹھیک تو نہیں ہے۔ سچویشن میں پریشان

"ہونا تو بجائے خود ایک مصیبت ہے۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر اسے سمجھانے لگا تھا۔

"رہنے دیں مرتضیٰ بھائی۔ یہ تمام باتیں پاپا اور میں انہیں بہت دفعہ سمجھا چکے ہیں مگر کوئی فائدہ نہیں۔" علی نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"آپ لوگ کیا اس وقت مجھے ڈسکس کرنے بیٹھے ہیں۔" وہ ناراض ہو گئی تھی۔

"آپ کی اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں۔" مرتضیٰ نے بردباری سے کہا۔

"میں بگڑی ہوئی ہی ٹھیک ہوں۔" وہ واک آؤٹ کے ارادے سے کھڑی ہو گئی۔

"پری ناراض ہو کر تو مت جائیں۔" علی نے اسے منانے کی کوشش کی۔

"ہاں fairy آپ بیٹھ جائیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تو وہ بیٹھنے کے بجائے اسے کھڑی ہوئی گھورتی رہی۔

"یہ اسی نے تمہیں کہا ہو گا کہ مجھے پری کہا کرو۔ پتا نہیں لوگوں کو اپنے بارے میں اتنی خوش فہمی کیوں ہوتی ہے۔" وہ اسے چڑا رہا تھا اور وہ واقعی چڑ بھی گئی تھی۔ علی مسلسل مسکراتا ہوا کبھی اسے اور کبھی مرتضیٰ کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اندر جاتے دیکھ کر علی نے روکا تھا مگر وہ رکنے کے بجائے یہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی تھی "مجھے پاپا کے لیے سوپ بنانا ہے۔"

♥ ♡ ♡ ♥

وہ لوگ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے جب کریم بابا نے مرتضیٰ کے ڈیڈی کے فون کا بتایا۔ وہ پاپا سے بات کرنا چاہتے تھے۔ پاپا اٹھ کر بات کرنے کے لیے چلے گئے۔ تین چار منٹ بعد پاپا کی واپسی ہوئی تو علی بولا۔ "خیریت انکل کو آپ سے کیا کام پڑ گیا؟"

"وہ اور ان کی مسز آج شام ہمارے ہاں آنا چاہ رہے ہیں۔ وہی پوچھ رہے تھے کہ میں بزی تو نہیں ہوں۔" پاپا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ ایک دم سر جھکا گئی تھی۔ پاپا یا علی سے نظریں ملانے کی اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اتنی بچی تو نہ تھی کہ بات نہ سمجھ پاتی کہ وہ لوگ کیوں آنا چاہتے ہیں؟ علی نے پاپا کے جواب پر ایک معنی خیز نگاہ بہن کے جھکے ہوئے سر پر ڈالی تھی اور بے اختیار مسکرا دیا تھا۔

اس طرح تو ابھی تک اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ تو ابھی اپنے دل پر گزرنے والی اس تازہ ترین واردات ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ یہ نیا مسئلہ سامنے آ گیا تھا۔ محبت سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی۔ اسے بھی سوچے سمجھے بغیر محبت ہو گئی تھی۔ وہ اپنا بچاؤ کرتے کرتے بالآخر اس کے آگے ہار گئی تھی مگر اس سے آگے ابھی اس نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے اس مسئلے کا حل سوچ رہی تھی۔ وہ پاپا اور علی کو چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہے اس بات کے لیے وہ خود کو کیسے قائل کر سکتی تھی۔ تو کیا وہ مرتضیٰ سے دستبردار ہونے کو تیار ہے۔ اس کا دل دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک پاپا اور علی کا طرف دار تھا تو دوسرا مرتضیٰ کا۔ وہ کوئی بھی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اسے کسی کو بھی نہیں چھوڑنا پڑے۔ وہ تمام لوگ جن سے وہ پیار کرتی ہے وہ سب ایک ہی وقت میں اسے مل جائیں۔ وہ ایک محبت پانے کے لیے دوسری محبت کھونے کا حوصلہ خود میں نہیں پا رہی تھی۔ اپنے اندر چھڑی یہ جنگ اسے نڈھال کر رہی تھی۔ وہ دونوں میں سے جس کسی کے حق میں بھی وہ فیصلہ کرتی دکھ تو اسے ملتا۔ وہ کسے چھوڑ دے اور کسے اپنائے۔ وہ کس سے مدد مانگے اسے بتائے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ کسی بھی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ پائی تھی۔

شام میں آنٹی اور انکل ان کے گھر آئے تھے۔ پاپا اور علی نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا تھا۔ وہ بڑی مشکلوں سے خود کو تمام صورت حال کے لیے تیار کر کے ٹرالی لے کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ آنٹی اور انکل نے حسب سابق بڑی محبت اور شفقت سے اس کا حال احوال دریافت کیا تھا۔ وہ بمشکل چار پانچ منٹ وہاں بیٹھ کر اٹھ گئی تھی۔ پھر وہ لوگ کتنی دیر بیٹھے اور کب گئے وہ اس بات سے انجان اپنے کمرے میں

بیٹھی رہی۔ پاپا اسے کسی بات کے لیے مجبور نہیں کریں گے۔ وہ جو فیصلہ کرے گی وہ اسے قبول کر لیں گے۔ اسے اس بات کا سو فیصد یقین تھا۔ مگر وہ فیصلہ کرے گی کیا؟ پاپا جب اس کی رائے پوچھیں گے تو وہ کیا جواب دے گی؟ وہ اس مقام پر آ کر خود کو جتنا بے بس محسوس کر رہی تھی اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ رات کھانے کے بعد وہ اکیلی کتنی ہی دیر تک لان میں واک کرتی رہی تھی۔ اپنے آپ سے الجھتے الجھتے وہ تنگ آ گئی تو تمام سوچیں ذہن سے جھٹکتے وہ علی کے کمرے میں آ گئی۔ کچھ نہیں تو اس سے باتیں کر کے وہ تھوڑی فریش ہی ہو جائے گی۔ وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو وہ بستر پر اوندھا لیٹا کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اپنی باتوں میں مگن اسے اس کے اندر آنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ وہ بڑا بھرپور قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"مان گئے آپ کو مرتضیٰ بھائی۔ جو کام آج تک کوئی نہیں کر سکا وہ آپ نے کر دکھایا۔" وہ اس کی کسی بات کے جواب میں بولا تھا۔

"ہاں اس وقت ان میں یہاں سے وہاں مارچ پاسٹ ہو رہا ہے۔ ویسے بے فکر رہیں فیصلہ آپ ہی کے حق میں ہو گا۔" وہ بڑے مزے سے بولا۔

"دعائیں دیں مجھے اگر پچھلے ہی وقت اپنا پرپوزل بھجوا دیتے اور جواب میں وہی سب ہوتا جو اس سے پہلے اوروں کے ساتھ ہوتا آیا ہے پھر میں پوچھتا کہ لفظ No سننا کیسا لگتا ہے۔"

کوئی عمارت جیسے دھڑام کی پوری اس پر آ گری تھی۔ وہ اس کے پیچھے ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔

"آپ کو خود ہی شوق ہے مشکل کام کرنے کا۔ میں نے تو پہلے ہی بتایا تھا۔ یہ آپ کی زندگی کا مشکل ترین پروجیکٹ ہے اس سے کہیں آسان تو اہرام مصر کی ڈرافٹنگ رہی ہو گی۔" کب کے نے جملوں کا مطلب آج اس پر واضح ہوا تھا۔ جبکہ دوسری طرف علی اس کی آمد سے بے خبر اپنی باتوں میں مصروف تھا۔

"ہاں جی کیا بات ہے آپ کی۔ آپ اپنے چیلنج میں جیت گئے میں ہار گیا۔ لیکن یہ ہار مجھے بہت خوش کر رہی ہے۔ اس جگہ ہار جانے کی تو میں کب سے دعائیں مانگ رہا تھا۔

ویسے آپ ہیں بھی تو بڑے مستقل مزاج۔ میں آپ کی جگہ ہوتا تو کب کا میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا۔" علی نے سیدھے ہو کر لیٹتے ہوئے کہا تو سامنے کھڑی تانیہ کو دیکھ کر وہ بری طرح بوکھلا گیا۔ اس کے چہرے پر موجود تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ سب کچھ سن چکی ہے۔

"مرتضیٰ بھائی میں آپ کو بعد میں کال کروں گا۔" اس نے پریشانی کے عالم میں ریسیور رکھا تھا۔

"آپ پری بیٹھیں۔" وہ ڈرتے ہوئے بولا۔ وہ ایک ایک قدم اٹھاتی اس کے پاس آئی تھی۔ علی بوکھلاہٹ میں بستر سے اتر گیا تھا۔

"میں نے تمہیں جنم نہیں دیا مگر ماں بن کر پالا تو تھا۔ میرے ہاتھوں میں پل کر آج تم اس قابل ہو چکے ہو کہ مجھے چیلنج بنا کر دوسروں کے سامنے پیش کر سکو میرے اوپر شرطیں لگا سکو۔" وہ کسی صدمے کے زیر اثر ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ لہجے میں برف جیسی ٹھنڈک تھی۔

"پری آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے بائی گاڈ۔" وہ بڑی عاجزی سے بولا تھا اور جواب میں اس نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا تھا۔ وہ اپنے گال پر ہاتھ رکھے اپنی اس بہن کو دیکھ رہا تھا جس نے کبھی اسے اونچی آواز میں ڈانٹا تک نہیں تھا۔

"علی مجھے تم سے سخت نفرت محسوس ہو رہی ہے۔ پتا نہیں آج کے بعد میں کسی پر اعتبار کر سکوں گی یا نہیں اور آج کے بعد کون ہو گا جس پر میں فخر کروں گی۔ جو میرا مان میرا غرور ہو گا۔ علی تم نے مجھے میری اپنی ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ علی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے چپ کرانا چاہا تو وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر چیخ اٹھی تھی۔

"اتنی ہی بوجھ لگنے لگی تھی میں تمہیں تو تم مجھے کہتے میں تمہاری زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل

جاتی بھی اپنی شکل تک نہیں دکھاتی۔ مگر یوں مجھے ذلیل کرنے کا حق تمہیں کس نے دیا تھا۔"

"پری پلیز میری بات تو سنیں۔ مجھے میری بات کی وضاحت تو کرنے دیں۔" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے اس کے سامنے خود کو بے قصور ثابت کرے۔ وہ جیسا نہیں تھا ویسا ثابت ضرور ہو رہا تھا۔ جسے دکھوں سے بچانا چاہتا تھا جس کے لیے ساری دنیا کی خوشیاں اکٹھی کرنا چاہتا تھا وہ بری طرح اس سے بدگمان ہو چکی تھی۔

"بھائی تو بہت غیرت والے ہوتے ہیں۔ بہن کے لیے جان تک دے دیتے ہیں۔ تم کیسے بھائی ہو۔ لیکن بے فکر رہو میں تمہاری ساری پریشانی دور کر دوں گی۔ جو بھی وجہ ہو لیکن تم مجھ سے بے زار ہو چکے ہو۔ تو میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔ تمہارے مرتضیٰ صاحب سے تو نہیں لیکن ان کے علاوہ کسی سے بھی شادی کر کے میں تمہیں اپنی منحوس صورت آئندہ کبھی نہیں دکھاؤں گی۔" وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"پری ایسا نہیں ہے میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں۔" وہ اپنے آنسوؤں پر بڑی مشکلوں سے قابو پا کر بولا تھا۔

"آج سے پہلے مجھے بھی یہی خوش فہمی تھی کہ میرا بھائی جسے میں نے ماں اور بہن دونوں کا پیار دیا ہے وہ بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتا ہے۔ میں اس کی ماں نہ سہی ماں جیسی ضرور ہوں۔" وہ اس کی طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ ان آنکھوں میں اپنے لیے نفرت دیکھ کر وہ کسی چھوٹے سے بچے کی طرح سہم گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے اپنے رویے کی وضاحت کرنا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ غلط سمجھ رہی ہے مگر اچانک ہی الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ گم سم سا کھڑا رہ گیا تھا اور وہ اس کے کمرے سے نکل گئی تھی۔

"پری میں آپ سے اپنی جان سے بھی بڑھ کر پیار کرتا ہوں۔ کیسے یہ بات آپ کو بتاؤں۔ آپ کے لیے میں اپنی جان تک دے سکتا ہوں۔ پلیز میرا اعتبار کریں۔ کیا آپ کا بھائی ایسا ہو سکتا ہے۔" وہ رو رہا تھا۔

صبح وہ صرف پاپا کی وجہ سے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ ساری رات روتے سسکتے گزار کر وہ بالکل نڈھال ہو چکی تھی۔ ڈائننگ روم میں داخل ہوئی تو پاپا اور علی دونوں ناشتے کی میز پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے ایک نظر علی کے چہرے پر ڈالی وہاں اداسی اور گہرا ملال چھایا نظر آیا۔

"علی محبت تو تم سے ہمیشہ کروں گی کہ یہ میری مجبوری ہے۔ تمہاری محبت میری رگوں میں خون کے ساتھ دوڑ رہی ہے۔ مگر اب شاید میں کبھی تم پر اعتبار نہیں کر سکوں گی۔ تم نے میری انا میری خودداری اور میری نسوانیت کا خون کیا ہے۔ اعتبار قائم کرنے میں برسوں لگتے ہیں اور ٹوٹنے میں صرف ایک لمحہ۔ میرا وہ بھائی جسے میں نے گودوں میں کھلایا تھا۔ اس نے اس طرح میری تحقیر کی ہے کہ اب میں خود سے بھی نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی۔ علی تم نے ایسا کیوں کیا؟"

وہ خاموشی سے ناشتا کر رہی تھی۔ علی نے برائے نام ناشتا کیا تھا۔ پاپا نے دونوں کے چہروں پر چھائی اداسی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ دونوں آپس میں بھی نہیں لڑے تھے۔ مگر اس وقت ایک دوسرے سے نظریں چرائے شاید صرف ان کی خاطر ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے۔ وہ ان دونوں سے اس بارے میں پوچھتے پوچھتے چپ ہو گئے۔ ان کے بچے بہت سمجھدار ہیں۔ وہ اپنے تمام مسائل خود ہی بہت اچھی طرح حل کر سکتے ہیں۔ انہوں نے ان دونوں کو موقع دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ جانتے تھے بات ہے وہ خود ہی اسے مل بیٹھ کر کلیئر کر لیں گے۔ ان کے درمیان کسی بھی قسم کا کمیونیکیشن گیپ نہیں ہے۔ انہوں نے حتمی طور پر یہی سوچا تھا۔ ناشتے کے بعد علی اس کے کمرے میں آیا تھا۔

"پری!" اس نے بڑی لجاجت سے اسے پکارا تھا۔

"علی میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" اس کے دو ٹوک اور سرد لہجے میں

کوئی تو ایسی بات تھی کہ وہ کانپ اٹھا تھا۔ وہ اس کی کوئی بھی بات سننے کے لیے تیار نہ تھی وہ ایک مایوس نگاہ اس پر ڈال کر کمرے سے نکل گیا تھا۔ وہ سارا دن اسی طرح گزر گیا تھا۔ علی کی التجائیہ نظریں اس کا غمزدہ چہرہ کوئی بھی چیز اس کا دل پگھلنے میں کامیاب نہ ہوئی تھی۔

اگلے روز جب وہ ناشتے کے بعد آفس کے لیے تیار نہ ہوا تو پاپا نے اس سے کہا۔

"کیا بات ہے بیٹا آفس نہیں جاؤ گے؟"

"پاپا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ شاید مجھے بخار بھی ہو رہا ہے۔" علی کی بات پر تانیہ نے اسے دیکھا وہ ایک دن میں برسوں کا بیمار نظر آ رہا تھا۔ وہ دل کو کڑا کر کے اس کی طرف سے نگاہیں ہٹا کر دوبارہ اخبار پڑھنے لگی۔ پاپا نے ہاسپٹل جانا دوبارہ شروع کر دیا تھا سو وہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد علی اپنے کمرے میں بند ہو گیا اور وہ اکیلی گھر میں ادھر ادھر پھرتی رہی۔ دونوں میں سے کسی نے بھی دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ شام ہو رہی تھی پاپا کے آنے کا ٹائم ہو گیا تھا اسی لیے وہ خود کو فریش کر کے پاپا کا انتظار کرنے لگی۔ لان میں چیئر پر بیٹھی وہ خالی الذہنی کے عالم میں گیٹ کی طرف دیکھ رہی تھی جب اس نے مرتضیٰ کو اندر آتے دیکھا۔ اس شخص سے وہ آئندہ کبھی بھی نہیں ملنا چاہتی یہ بات تو اس نے برسوں رات ہی سوچ لی تھی۔ اسے اسی طرف آتے دیکھ کر وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور اندر جانے کے لیے قدم بڑھانے ہی والی تھی کہ وہ اس کے پاس آ گیا۔ اس کے چہرے پر کسی بھی طرح کی شرمندگی یا ندامت رقم نہیں تھی۔ یا تو اسے کچھ معلوم ہی نہیں وہ جانتا ہی نہیں کہ اسے سب پتا چل چکا ہے یا پھر وہ بہت ہی ڈھیٹ اور بے غیرت انسان ہے۔ تانیہ نے دل میں سوچا تھا۔

"کیا کرتی پھر رہی ہو تم؟" وہ ناراض انداز میں گویا ہوا تھا۔

"وہ تو میری علی سے فون پر بات ہو گئی تو مجھے پتا چلا۔ تانیہ یہ سب کیا ہے؟" وہ اس کی دیدہ دلیری پر ششدر تھی حیران ہوئی کم تھی۔ "آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

you planned to har done"

What ever جائیے جا کر اپنی فتح کا جشن منائیے آپ سے بڑا چیلنجر بھلا اور کون ہو گا۔ میں آپ کو چیلنج لگی اور آپ شہر فاتح عالم آپ نے مجھے تسخیر کر لیا۔ دنیا کی سب لڑکیاں ایک سی ہوتی ہیں میں بھی مختلف تو نہ تھی جھوٹی باتوں اور پر فریب محبت کے جال میں پھنس جانے والی۔ جائیے جا کر خوشیاں منائیے آپ نے ایک ایسی لڑکی کو اپنے قدموں میں جھکا لیا ہے جو آپ کو مقابلے کی دعوت دے رہی تھی۔ میں بھی انہیں عام سی لڑکیوں کی قطار میں کھڑی ہوں جن کے ساتھ آپ وقت گزاری کرتے ہوں گے اور لطف اس کی بات مرتضیٰ کی چیختی ہوئی آواز نے کاٹ دی تھی۔

"It s enough taeba" وہ ہاتھ اٹھا کر اسے وارننگ دے رہا تھا چہرے پر غیض و غضب کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ کڑی نظروں سخت تیوروں سے اسے گھور رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ اپنا غصہ بڑی مشکلوں سے کنٹرول کر رہا ہے۔

"کیا سمجھتی ہو تم خود کو؟ کوئی دیوی کوئی ہیروئن۔ کون ہو آخر کہ تم سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی اور دوسرے سب غلط ہیں۔ تم اپنے نکتہ نظر سے ہر کسی کے بارے میں سوچو گی اور فیصلے کرو گی۔ جو تم سوچو گی وہ سب صحیح ہو گا اور باقی دوسرے سب جھوٹے ہیں سازشی ہیں۔ تانیہ شعیب مجھے یہ بات کہہ لینے دو کہ تم خود کو دوسروں سے بلند ایک آفاقی مخلوق سمجھتی ہو۔ تم بہت اپنے آپ کی ہو۔" وہ اس پر اپنی غصے سے بھری نگاہیں جما کر بولا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی پر دھکیل کر بٹھا کر وہ بھی اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔

"تم بہت اچھی ہو۔ دوسروں سے مختلف ہو۔ تم اپنی خوشیاں فراموش کر کے اپنے باپ اور بھائی کے لیے قربانیاں دے سکتی ہو۔ اپنی زندگی تج سکتی ہو۔ دوسروں کی طرح یہ بات میں بھی مانتا تھا مگر اب نہیں مانتا۔ انکل اور علی سے تمہاری بے تحاشا محبت دراصل تمہاری خود اپنے آپ سے محبت ہے۔ دوسروں کو اپنا زیر بار رکھنا کہ وہ کبھی بھی تمہارے

احسانات کے سامنے سر نہ اٹھا سکیں۔ تمہاری قربانیاں تمہاری محبتیں ان سب سے مجھے غرور کی بو آتی ہے جن پر تم یہ احسانات کر رہی ہو کبھی ان سے پوچھو کہ انہیں تمہاری قربانیاں درکار بھی ہیں یا نہیں۔ وہ تمہارے احسانوں کا بوجھ اٹھانا بھی چاہتے ہیں کہ نہیں۔“ وہ مرتضیٰ کے جملوں پر ششدر بیٹھی تھی۔ وہ اسے اس کی اپنی ہی بہت بدصورت شکل آئینے میں دکھا رہا تھا۔

”کیا جانتی ہو تم؟ کچھ بھی نہیں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ انکل کی بیماری کا سبب کیا ہے؟ وہ اس طرح ٹوٹ کیوں گئے صرف اور صرف تمہاری وجہ سے انہیں دن رات تمہاری فکر کھائے جاتی ہے۔ ان کی بیٹی اپنے گھر میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ایک پرسکون ازدواجی زندگی گزارے یہی ان کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ مگر اس کی تکمیل کے لیے وہ تمہیں مجبور نہیں کر سکتے۔ تمہاری سونی زندگی انہیں دکھوں کے سمندر میں دھکیل رہی ہے اور علی! جانتی ہو وہ کیا کہتا ہے تمہارے بارے میں۔ مگر تم کیسے جان سکتی ہو تم تو سب سے اعلیٰ و ارفع بہت اونچی مسند پر چڑھی بیٹھی ہو۔“ وہ بڑی بے رحمی سے اس کی شخصیت کا تجزیہ کر رہا تھا۔ وہ اس کے لفظوں پر کانپ گئی تھی۔

”تمہیں چاہے میری یہ باتیں بہت بری لگ رہی ہوں مگر آج میں تم سے سب کچھ کہہ دینا چاہتا ہوں۔ بہت دعویٰ ہے تمہیں انکل اور علی سے محبت کا۔ بولو کتنا جانتی ہو تم انہیں؟“ وہ کچھ بھی بولے بغیر آنکھیں پھاڑے غیر یقینی کے عالم میں بیٹھی اسے تک رہی تھی۔ اسے شاید خود ہی اپنے لفظوں کی سختی کا احساس ہو گیا تھا اسی لیے لہجے کو قدرے نرم کرتا ہوا بولا ”میں نے بہت دنیا دیکھی ہے۔ بہت سی لڑکیوں سے ملا ہوں بہت سوں سے دوستی بھی ہوئی مگر محبت کبھی کسی سے نہیں ہوئی۔ مگر جب تم ملیں تو میرے دل نے گواہی دی یہی ہے وہ۔ جس کی مجھے تلاش تھی۔ ایک ایسی لڑکی جو بیٹی اور بہن بن کر محبتوں کے خزانے لٹاتی ہے وہ جب کسی کی بیوی بن کر ایسی ہی بے مثال محبت اور چاہت کا اظہار کرے گی تو کتنی حسین لگے گی وہ شخص کتنا خوش قسمت ہوگا جسے ایسی ہمسفر ملے گی اور کیا وہ خوش قسمت انسان میں نہیں ہو سکتا؟ یہ تمام باتیں تم سے محض دوسری ہی ملاقات میں میں نے سوچ ڈالی تھیں۔ صرف کسی کو جھکانے یا توڑنے کے لیے محبت نہیں کی تھی میں نے میں تمہیں پروپوز کرنا چاہتا تھا مگر اس سے بھی پہلے میں یہ بات علی سے کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ تمہارے گھر آنا اور تم سے ملنا علی ہی کے توسط سے ہوا تھا۔ میں اس بات کو بہت بڑی بددیانتی سمجھتا تھا کہ علی کے حوالے سے تمہارے گھر آؤں اور اس کے علم میں لائے بغیر تمہیں کسی اور حوالے سے دیکھوں یا سوچوں۔ میں نے اپنا پرپوزل علی کے سامنے رکھنے کا فیصلہ کیا اور جب میں نے اپنی خواہش کا اظہار اس سے کیا تو بحیثیت ایک بھائی کے اس نے اس رشتے کو قبول کر لیا۔ میں نے رشتہ بھجوانے کی بات کی تو اس نے مجھے روک دیا اور پھر علی نے مجھے تمہارے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔ یہی کہ تم نے اس کی خاطر بہت قربانیاں دی ہیں اس کے لیے اپنا بچپن اپنے شوق اور اپنی ہر خواہش پس پشت ڈال دی اور اب بھی محض اس کی اور پاپا کی وجہ سے شادی کرنے سے انکاری ہو۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ دن اس کی زندگی کا خوب صورت ترین دن ہو گا۔ جب وہ اپنی بہن کو دلہن بنا کر اپنے ہاتھوں سے رخصت کرے گا۔ وہ تم سے کتنی محبت کرتا ہے تم شاید کبھی اس کا اندازہ بھی نہیں کر پاؤ۔ اس نے مجھے بتایا کہ شادی کے لیے تم کسی کی بات نہیں سنتیں اور اس وقت علی نے [illegible] اور بھائی کی خواہش کے مطابق ایک نارمل زندگی گزارو گی۔ ان تمام باتوں کو اگر تم پلان کہتی ہو تو ہاں یہ پلان ہی تھا۔ مگر اس سارے قصے میں ہم میں سے کسی نے بھی تمہاری تضحیک نہیں کرنی چاہی تھی۔ ہم تمہیں تمہاری خامیوں کا احساس دلائے بغیر تم میں تبدیلی لانا چاہتے تھے۔“ وہ ایک لمحے کو رکا تھا۔ اس کے چہرے پر تفکر تھا۔۔۔ وہ دوبارہ بولا۔

”تمہیں پتا ہے کہ تمہاری وجہ سے علی اپنی محبت سے دستبردار ہو گیا۔ منال اس کی کلاس فیلو جسے وہ بہت پسند کرتا ہے محض تمہاری وجہ سے وہ اس سے قطع تعلق کر گیا۔ اس کے ماں باپ اس کا [illegible] اور رشتہ مانگ رہے ہیں اور علی میرے سمجھانے کے باوجود کسی بھی قسم کی پیش قدمی کے لیے تیار نہیں۔ جب تک تم اپنی زندگی میں سیٹل نہ ہو جاؤ وہ خود پر ہر طرح کی خوشیاں حرام کر چکا ہے۔ کیا تم نے کبھی سوچا کہ علی آج کی عمر میں اتنا سنجیدہ اور رنجور کیوں ہو گیا ہے؟ اسے ہر لمحہ تمہاری فکر رہتی ہے۔ یہ احساس رہتا ہے کہ تم اپنے حصے سے بہت زیادہ محبت اس پر نچھاور کر چکی ہو اور پتا ہے آج فون پر وہ مجھ سے روتے ہوئے کیا کہہ رہا تھا؟ وہ کہہ رہا تھا ”مرتضیٰ بھائی باجی کے ہر دکھ کی وجہ میں ہی ہوں۔ میں پیدا ہوا اور باجی سے بھی بچپن چھن گیا۔ کاش میں مر جاتا اور ممی بچ جاتیں پھر باجی ایسی نہ ہوتیں۔ وہ بھی اور لڑکیوں کی طرح ہنستی مسکراتی خوش و خرم اور مطمئن۔ کاش میرے بس میں ہوتا میں ساری کائنات کی خوشیاں اکٹھی کر کے اپنی بہن کی جھولی میں ڈال دیتا۔“ وہ مرتضیٰ کے منہ سے علی کے کہے ہوئے جملے سن کر رو پڑی تھی۔

”تم خود کو بدلو ان تمام لوگوں کے لیے جو تم سے پیار کرتے ہیں جنہیں تمہاری پروا ہے۔ محبت میں گیو اینڈ ٹیک اچھا لگتا ہے۔ تم یہ کیوں چاہتی ہو کہ صرف تم ہی دیے جاؤ اور دوسرے تم سے لیے جائیں۔ انکل علی اور میں ہم سب تم سے پیار کرتے ہیں۔ اپنے پیاروں کے لیے خود کو بدل ڈالو ورنہ تم اکیلی رہ جاؤ گی۔“ مرتضیٰ نے اس کی طرف جھک کر اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”دیوی کی پوجا کی جاتی ہے ان سے محبت نہیں کی جاتی۔ تم نادانستگی میں دیوی ہی بننے کی کوشش کرنے لگی ہو۔ اپنے پجاریوں کو دان کرنا دیوی دیوتاؤں کا ہی شیوہ ہوتا ہے۔ مگر تم نے کبھی سوچا کہ دیوی دیوتا کو مورتی بنا کر ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے ان کی عبادت کی جاتی ہے۔ اسی طرح تم بھی اکیلی رہ جاؤ گی۔ کچھ وقت گزرے گا علی کے لیے تمہاری محبت صرف ایک احسان بن کر رہ جائے گی ایسا احسان جس کا بدلہ وہ کبھی نہیں چکا سکتا۔ وہ ہمیشہ تم سے جھک کر ملے گا یہ احساس ساری زندگی اسے کچوکے لگاتا رہے گا کہ تمہاری زندگی کی بربادی کا ذمہ دار وہ ہے۔ اس کے دل میں تمہاری محبت آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی۔ صرف ایک دیوی وہاں براجمان ہو گی جس کی وہ پرستش کیا کرے گا۔ مگر جس سے وہ شاید اس وقت محبت نہیں کرتا ہو گا۔ وہ خود کو تمہارے مقابلے میں اتنا چھوٹا اتنا حقیر سمجھنے لگے گا کہ وہ خود کو تم سے محبت کرنے کا اہل ہی نہیں سمجھے گا۔“ مرتضیٰ نے اس کے ہاتھوں کے اوپر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

”میری باتوں پر غور کرنا۔ میں تمہیں کسی بات کے لیے مجبور نہیں کر رہا مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم سچائی کا سامنا کرو۔ تم کہاں پر غلط ہو اس بات کا فیصلہ کرو۔“ مرتضیٰ نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا اور اس کے چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

وہ گم سم بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنی ذات کے حصار میں قید اس نے یہ بات تو کبھی سوچی ہی نہیں تھی کہ دوسرے لوگ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ وہ ان جانے میں کتنے لوگوں کے دکھوں کا سبب بنی تھی۔ پاپا اس کی وجہ سے پریشان تھے اور علی اس کی خاطر اپنی خوشیوں کی قربانی دے رہا تھا اور وہ خود کتنی خود غرض تھی ہمیشہ اپنے دل کی مانتی رہی کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ دوسرے لوگ اس سے کیا چاہتے ہیں اور علی میرا پیارا بھائی اسے میں نے کتنا ہرٹ کیا۔ علی کا خیال آتے ہی وہ دیوانہ وار اٹھ کر بھائی کے کمرے کی طرف بھاگی۔ ساری خفگی ساری ناراضگی غائب ہو چکی تھی اب صرف یہ خیال باقی تھا وہ اداس ہے اکیلا ہے میری خفگی اسے پریشان کر رہی ہے۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تو وہ تکیے میں منہ دیے پڑا تھا۔ پورا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز بھی وہ نہیں پہچان سکا تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر تمام لائٹس آن کر دیں علی نے سر اٹھا کر آنے والے کو دیکھنا چاہا تو

سامنے کھڑی تابندہ کو دیکھ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

"پری آپ؟" وہ جواب میں کچھ بھی کہے بنا آگے بڑھی اور بے اختیار اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"پری آپ ٹھیک تو ہیں؟" وہ اس کے رونے پر ہراساں پوچھ رہا تھا۔ تابندہ نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور بولی۔

"علی میری جان میرے چندا مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں ہرٹ کیا۔ تم پر ہاتھ اٹھایا۔ علی مجھے معاف کر دو۔" وہ دیوانگی کے عالم میں اسے پیار کر رہی تھی اس کے ہاتھ چوم رہی تھی۔

"پری آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ معافی تو مجھے آپ سے مانگنی چاہیے۔ مگر میرا یقین کریں اس تمام قصے میں، میں نے کبھی بھی آپ کی انسلٹ نہیں کرنی چاہی تھی۔" وہ بڑے دکھ سے بولا تو تابندہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"سب پتا ہے مجھے تمہیں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ تم بس مجھے معاف کر دو۔"

"آپ اس طرح معافی مانگ کر مجھے اذیت تو مت دیں۔ آپ مجھ پر ہر طرح کا حق رکھتی ہیں۔ پری مجھے اور ماریں جتنا دل چاہے ماریں مگر آئندہ کبھی مجھ سے خفا مت ہوئیے گا۔ آپ کی خفگی میں سہہ نہیں سکتا۔" اس کی بھرائی ہوئی آواز پر تابندہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ آنسوؤں پر بند باندھ رہا تھا۔ اس نے بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں چھپا لیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ بچپن میں اسے چھپا لیا کرتی تھی۔

"علی یو آر مائی سوئیٹ ہارٹ میری جان۔" وہ اسے پیار کر رہی تھی۔ کتنی ہی دیر تک وہ اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹا رہا اور وہ دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔

"پری آپ کو مجھ پر بھروسا ہے ناں۔ آپ اب تو مجھ سے ناراض نہیں؟" علی نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں علی تم پر تو مجھے اپنی ذات سے بھی بڑھ کر اعتماد ہے۔ مرتضیٰ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ ہمیں کیا پتا تھا کہ میرا بھائی اب اتنا بڑا تو ہو ہی گیا ہے کہ مجھ سے باتیں چھپانے لگا ہے۔" وہ مسکرائی تھی۔

"پری وہ سارا پلان مرتضیٰ بھائی کا تھا۔ وہ پتا نہیں کیا سمجھا تھا۔" وہ اس کی ناسمجھی پر ہنس پڑی۔

"پتا ہے پری جب میں پہلی بار مرتضیٰ بھائی کی فرم میں گیا اور وہاں میری ان سے ملاقات ہوئی تو انہیں دیکھ کر میرے دل میں کیا خیال آیا تھا۔" وہ کوئی بات یاد کر کے بولا تھا۔

"کیا خیال آیا تھا؟"

"میرے دل نے کہا تھا کہ میرے بہنوئی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس سے پہلے پھوپھو کے فیضان خالہ کے نواد اور عاصم اور دوسرے بہت سے لوگوں میں سے کسی کو دیکھ کر کبھی بھی میرے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں جاگی تھی۔ عاصم کے لیے بھی میں نے صرف پاپا کی وجہ سے آپ کو کنونس کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر مرتضیٰ بھائی میں کوئی خاص بات تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ میری اتنی پیاری اور غیر معمولی بہن کے لیے بندہ بھی کوئی ایکسٹرا آرڈنری خوبیوں کا مالک ہی ہونا چاہیے۔ وہ اتنے جینئس، کیئرنگ اور ہینڈسم ہیں کہ مجھے ان سے بہتر آپ کے لیے کوئی اور نہ لگا۔ پھر جب انہوں نے مجھے جاب آفر کی تو میں نے ان کی آفر صرف اس لیے قبول کر لی کیونکہ میں ان کے قریب آنا چاہتا تھا۔ اس وقت میں صرف ایک بھائی بن کر سوچ رہا تھا مجھے وہ بندہ اپنی بہن کے لیے پسند آ گیا تھا۔ وہ میرے کام سے اور میری صلاحیتوں سے متاثر تھے مجھے ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے تھے یوں میں دن بدن ان سے قریب ہوتا چلا گیا۔ میں انہیں پہلی مرتبہ ہمارے گھر بھی جان کر لایا تھا اور خدا سے میں نے بہت دعائیں مانگی تھیں کہ کچھ ایسا ہو جائے یہ بندہ میری بہن کا نصیب بن جائے اور خدا نے میری دعاؤں کو قبول کر لیا تھا۔ میں اپنی اس خواہش کا اظہار ان سے کیسے کر سکتا تھا اپنے منہ سے یہ کیسے کہہ سکتا تھا

کہ میری بہن سے شادی کر لیں مگر میرے کچھ بھی کہے بغیر انہوں نے خود ہی مجھ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ آپ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

علی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور بڑی تفصیل سے اسے تمام باتیں بتا رہا تھا۔

"یاد ہے پری وہ دن جب مرتضیٰ بھائی نے مجھے ڈنر پر انوائیٹ کیا تھا اور آپ بڑی مشکوک ہوئی تھیں کہ وہ مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہیں۔ اس رات مرتضیٰ بھائی نے آپ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میرے انکار کا تو کوئی جواز ہی نہ تھا وہ ہر لحاظ سے آپ کے قابل تھے سو میں نے اپنی طرف سے رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔" علی کوئی بات یاد کر کے ہنس پڑا تھا۔ "شادی سے انکار کرنے کے معاملے میں وہ بھی بالکل آپ کی طرح تھے۔ ان کے گھر والے کہہ کہہ کر تھک چکے تھے اور وہ شادی کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ ان کے انکار کی وجہ یہی تھی کہ انہیں کبھی کوئی لڑکی اس حد تک پسند نہیں آئی تھی کہ وہ اس سے شادی کا فیصلہ کر لیتے۔ پھر جب انہوں نے آپ کا انتخاب کیا اور اپنے گھر والوں کو اپنی پسند سے آگاہ کیا تو ان کی ماما نے فوری طور پر آپ سے ملنا چاہا۔ مرتضیٰ بھائی نے اپنی یہ پرابلم میرے سامنے رکھی۔ آپ کو ان سے ملوانے کا یہی طریقہ سمجھ میں آیا کہ ایمن کی منگنی پر آپ کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ آپ کو اپنی ہونے والی ساس سے پہلی مرتبہ ملنا تھا تو اس کے لیے ڈھنگ سے تیار بھی ہونا تھا۔ وہ جتنی بھی اچھی سی ہوتیں تو ایک ساس ہی۔ انہوں نے جو اگر آپ کو عام سے حلیے میں دیکھ کر یہ کہہ کر ریجیکٹ کر دیا کہ خالی اچھی شکل سے کیا ہوتا ہے۔ لڑکی کو پہننے اوڑھنے کا سلیقہ نہیں۔ سوسائٹی موو کرنی نہیں آتی۔ کس فنکشن میں کیسا لباس پہننے یہ پتا نہیں ہے۔" اسی لیے میں آپ کو خوب اچھی طرح تیار کروا کر لے گیا اور نتیجہ ظاہر ہے بہت اچھا تھا۔ اکلوتے لاڈلے بیٹے کی پسند وہ بھی اتنی حسین۔ انہوں نے آپ کو پہلی نظر میں پسند کر لیا تھا بلکہ مرتضیٰ بھائی سے [illegible] میں کہہ کر

ہمارے ہاں رشتہ لے کر آ گئیں۔ بڑی مشکلوں سے مرتضیٰ بھائی نے انہیں روکا تھا۔" وہ علی کی مکاریوں پر ہنس رہی تھی۔

"علی تم نے مجھے کتنا بے وقوف بنایا ہے۔ میری ہر بات جا کر مرتضیٰ کو بتا دیتے تھے۔ بدتمیز۔" وہ زبردستی غصہ طاری کرتے ہوئے بولی۔ علی بھی اس کی بات پر ہنس پڑا تھا۔ "پری مرتضیٰ بھائی بہت اچھے ہیں۔ میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے وہ بہت ہی پیارے انسان ہیں۔" وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ مرتضیٰ کے خلاف ابھی بھی اس کے دل میں کوئی بدگمانی ہے اسی لیے بڑی سنجیدگی سے اس کی تعریف کرنے لگا۔

"ہاں مجھے معلوم ہے۔ وہ بہت اچھے ہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"ویسے کیا میں بہت بری ہوں؟" وہ شرارت سے مسکرا دی۔

"نہیں پری آپ تو سب سے اچھی ہیں۔ آپ سے اچھا تو کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔"

"کیا مثال بھی نہیں؟" علی نے ہونق ہو کر اس کی شکل دیکھی۔

"تم کیا سمجھتے ہو اگر تم نہیں بتاؤ گے تو مجھے کوئی بات پتا ہی نہیں چلے گی۔ ویسے مجھ سے اچھے تو مرتضیٰ ہی ہیں جن سے تم اپنے دل کی ہر بات شیئر کر لیتے ہو۔" وہ جان بوجھ کر اداس شکل بنا کر بولی تو علی کی جان پہ بن گئی۔

"میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ خود ہی سمجھ گئے۔ مثال ایک آدھ مرتبہ آفس آئی اور پتا نہیں مرتضیٰ بھائی کو کیسے پتا چل گیا میں نہیں جانتا بعد میں انہوں نے بڑی آسانی سے سب کچھ مجھ سے اگلوا لیا۔" وہ شرمندگی سے سر جھکا کر بولا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ویسے وہ ہے کیسی؟" اس نے فطری تجسس سے مجبور ہو کر پوچھا تو وہ مسکرا کر بولا۔

"پری وہ آپ کی جیسی ہے۔ مجھے اس میں جو بات سب سے زیادہ پسند آئی وہ یہ تھی۔ وہ آپ کی طرح

ہے۔ بالکل آپ کی طرح نرم محبت کرنے والی طبیعت کی مالک ——— اپنے آرام سے ہر کسی کو اپنی کتابیں، اسائنمنٹ اور لیکچرز دے دیا کرتی تھی چاہے مانگنے والا کوئی بھی ہو اور چاہے خود اسے ان چیزوں کی کتنی ضرورت ہی کیوں نہ ہو۔"

"تم بھی اس سے چیزیں لیا کرتے تھے؟" وہ بڑی توجہ سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کر رہی تھی۔

"نہیں میں تو خیر نہیں لیتا تھا۔ مگر اس کی اس حرکت کو بغور دیکھا ضرور کرتا تھا۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"علی تم نے مجھے اس کے بارے میں کبھی بتایا کیوں نہیں۔" وہ شکوہ کرنے لگی۔

"پری یقین کریں میری اس کے ساتھ کوئی کمٹمنٹ نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ وہ مجھے اچھی لگتی تھی اور شاید اسے بھی میں پسند تھا۔ ہمارے درمیان اس موضوع پر کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ یہ تو مرتضیٰ بھائی نے اس بات کو پتا نہیں کیسے بھانپ لیا اور اب تو اس کا رشتہ بھی طے ہونے والا ہے۔" وہ سر جھکا کر بولا۔

"ہونے والا ہے ہوا تو نہیں۔ وہ دوسرا جو کوئی بھی ہے میرے بھائی سے زیادہ اچھا تو نہیں ہو سکتا جو اس کے ماں باپ مانیں ہی نہیں۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"پری!" وہ حیرت سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ "علی تم میرے لیے اتنی بڑی قربانی دینے جا رہے تھے علی مجھ سے اتنا پیار مت کرو میں اس کی حق نہیں ہوں۔" وہ اپنے آنسو پیتے ہوئے بولی۔ علی نے ایک گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"آپ کو کیا پتا آپ میرے لیے کیا ہیں۔ پری کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ آپ واقعی اتنی زیادہ حسین ہیں یا صرف مجھے ہی ایسا لگتا ہے۔ ایسا کیوں لگتا ہے جیسے دنیا میں ساری خوب صورتی صرف آپ کی وجہ سے ہے۔" وہ علی کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔

"چلو چلو جھوٹ مت بولو۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ میں زیادہ خوب صورت ہوں یا منال۔" اور علی نے ایک دم جھینپ کر اپنا سر جھکا لیا تھا۔ وہ ایک پیار بھری نگاہ اس کے چہرے پر ڈال کر کھڑی ہو گئی۔

"علی پاپا سے کہنا کہ مرتضیٰ کی ماما کو ہاں کہہ دیں۔" علی اس کی بات پر خوشی سے چیخ اٹھا تھا۔

"ہرے۔" وہ پورے کمرے میں ناچتا پھر رہا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

زندگی اچانک ہی بڑی حسین ہو گئی تھی۔ ایک پھولوں بھری راہ گزر تھی جس پر وہ اپنے پیاروں کے ساتھ قدم سے قدم ملائے چل رہی تھی۔ اسے تھوڑے سے دنوں میں بہت سی خوشگوار تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ مرتضیٰ کی ماما اسے رنگ پہنا گئی تھیں۔ علی کی شادی طے ہو گئی تھی سب کچھ بہت دلکش اور خوش کن تھا۔ علی کی شادی کے ایک ہفتے بعد اسے مرتضیٰ کے سنگ رخصت ہو جانا تھا اور اس کے ٹھیک ایک مہینے بعد پاپا علی اور منال کو امریکہ فلائی کر جانا تھا۔ علی اپنے خوابوں کی تعبیر کے پہلے زینے پر قدم رکھ رہا تھا۔ امریکہ میں اسے ماسٹرز کرنا تھا۔ پھر وہاں سے واپس آ کر اسے اپنی فرم اسٹیبلش کرنی تھی۔ وہ اتنی جلدی شادی کے لیے تیار نہ تھا۔ اسے ابھی اپنا کیریئر بنانا تھا مگر مرتضیٰ نے علی کو قائل کر کے ہی دم لیا تھا۔ اس نے تابندہ کے بغیر ہی اس کے دل کی بات جان لی تھی وہ جانتا تھا کہ وہ نئی زندگی کی ابتدا اسی وقت پرسکون ہو کر کر سکتی ہے جب پاپا اور علی کا خیال رکھنے کے لیے منال آ جائے گی۔ وہ اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کرتی کم تھا۔ وہ اس کا کتنا خیال رکھتا تھا وہ کتنا محبت کرنے والا خیال کرنے والا تھا۔

اس پر چاروں طرف سے محبتوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ سب لوگ اس سے کتنا پیار کرتے تھے شکر تھا کہ مرتضیٰ نے بروقت اسے اس کی غلطیوں کا احساس دلا دیا ورنہ اگر خدانخواستہ دیر ہو جاتی پھر کیا ہوتا۔ جس روز مرتضیٰ کی ماما اسے رنگ پہنا کر گئی تھیں اسی رات مرتضیٰ نے اس سے فون پر کہا تھا۔

"تابندہ میری کوئی بھی بات اگر تمہیں بری لگی ہو تو میں تم سے معذرت کرتا ہوں۔ مگر یقین کرو تمہیں ہرٹ کرنا کبھی میرا مقصد نہیں تھا۔" اور جواب میں اس نے کہا تھا۔

"نہیں مرتضیٰ مجھے آپ کی کوئی بھی بات بری نہیں لگی۔ آپ تو میرے محسن ہیں آپ نے میرے لیے خضر کا کام کیا ہے۔ میری راہنمائی کی ہے۔ میں بدوابستگی میں دوسروں کو دکھ دینے کا باعث بن رہی تھی۔ جن سے میں پیار کرتی تھی ان کو اپنی ملکیت سمجھ کر ان کی اور اپنی زندگی کا ہر فیصلہ خود کرنے لگی تھی۔" اس کی بات پر مرتضیٰ بڑی سنجیدگی سے بولا تھا۔

"تابندہ تم بہت اچھی ہو مگر اپنی اچھائی نیکی اور محبت میں تم بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں اسی لیے میں نے تمہیں ٹوکا تھا۔ محبت ہو یا نفرت کسی بھی جذبے میں انتہا پسندی اچھی نہیں۔ تمہاری یہی سوچ خود تمہیں اور ہم سب کو نقصان پہنچا رہی تھی۔ اپنی خوشی کو دوسروں کے لیے قربان کرنا دوسروں کے لیے جینا یقیناً عین عبادت ہے مگر اس میں بھی اعتدال ہونا چاہیے اس بات کی تعلیم تو خود ہمیں ہمارے مذہب نے دی ہے۔ ہماری ذات کا بھی تو ہم پر کچھ حق ہے۔" اس نے بڑی نرمی سے اپنی بات کی وضاحت کی تھی۔

عید کے فوراً بعد علی کی شادی تھی۔ آنٹی اور ایمن نے علی کی شادی کی تیاری میں اس کی بھرپور مدد کرائی تھی۔ اس کے لاڈلے بھائی کی شادی تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کیا نہ کرے۔ عروسی لباس سے لے کر زیورات اور دیگر سامان تک اس نے ہر چیز ایک سے بڑھ کر ایک تیار کی تھی۔

چاند رات کو مرتضیٰ کا فون آیا۔

"کل شام میں تیار رہنا۔ ہم لوگ کہیں باہر چلیں گے۔" وہ اس کے اس انوکھے مطالبے پر ششدر رہ گئی۔

"لیکن میں کس طرح جا سکتی ہوں۔" اس نے کمزور سی آواز میں احتجاج کیا جسے مرتضیٰ نے خاطر میں لائے بغیر فوراً کہا۔ "کیوں تم کیوں نہیں جا سکتیں۔"

"عید کا دن ہو گا۔ گھر میں اتنا کام اور مہمان

"نروس۔" مرتضیٰ نے اس کی بات کاٹ دی اور حکمیہ انداز میں بولا۔

"میں کچھ نہیں جانتا بس تم میرے ساتھ چل رہی ہو۔"

"پلیز مرتضیٰ سمجھنے کی کوشش کریں۔ مجھے پاپا اور علی کے سامنے اس طرح جاتے بہت عجیب لگے گا۔" بالآخر اصل بات پر آ ہی گئی تھی۔

"عجیب کیوں لگے گا۔ میں نے انکل سے یہ مشن لینے کے بعد ہی تم سے کہا ہے۔ بس کل شام پانچ بجے میں آرہا ہوں۔ ذرا ڈھنگ سے تیار ہو جانا۔" وہ اسے حکم دے کر فون بند کر گیا اور وہ بے بسی سے سر تھام کر رہ گئی۔

اگلے روز وہ صبح سے کنفیوز تھی کہ کیا کرے۔ مرتضیٰ کو انکار بھی نہیں کر سکتی تھی اور یوں جانا اسے بہت ہی برا لگ رہا تھا۔ شام پانچ بجے وہ حسب وعدہ پہنچ گیا اس کی گاڑی کا ہارن پہچان کر وہ کچن میں کھڑے کھڑے ہی کچھ نروس سی ہو گئی۔ ایسی صورت حال کا سامنا اس نے کب کیا تھا۔ اسے پاپا اور علی کے سامنے اس طرح جاتے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چار منٹ بعد ہی علی کچن میں آ گیا اور بڑی شرارتی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولا۔

"میں حیران ہو رہا تھا کہ ہمیشہ بڑی بی بنی رہنے والی خاتون آج اس قدر تیار کس خوشی میں ہیں۔ وجہ اب سمجھ میں آئی ہے۔ جائیں وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔"

"علی فضول باتیں مت کرو۔" اس نے غصے کا اظہار کیا جبکہ علی اس کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھ کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ اسی لمحے پاپا نے اسے آواز دی تو بڑی دقتوں سے خود کو لاؤنج میں گھسیٹ کر لائی۔ سامنے ہی وہ پاپا کے ساتھ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر فوراً کھڑا ہو گیا اور پاپا سے بولا۔

"انکل ہم لوگ ڈیڑھ دو گھنٹے میں آجائیں گے۔"

"ہاں ہاں بیٹا آرام سے جاؤ۔" پاپا نے کھلے دل سے اجازت دی۔ جبکہ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ کیا سوچا ہوگا پاپا اور علی نے اس نے باقاعدہ پہلے سے مرتضیٰ کے ساتھ پروگرام طے کر رکھا تھا۔ وہ دل ہی دل میں مرتضیٰ سے خفا ہوئی۔

"چلیں!" وہ اب اس سے مخاطب تھا۔ وہ یونہی سر جھکائے اس کے پیچھے چلتی پورٹیکو میں آ گئی۔ گاڑی کا دروازہ کھولتے مرتضیٰ نے اس کا پھولا منہ دیکھا تو ہنستے ہوئے بولا۔

"اتنی اچھی تیاری کے ساتھ یہ پھولا ہوا منہ بالکل سوٹ نہیں کر رہا۔"

"آپ نے اتنی بری حرکت کی ہے۔ کیا سوچا ہوگا پاپا اور علی نے میرے بارے میں۔" وہ ناراض لہجے میں بولی تو وہ بے ساختہ بولا۔

"انہوں نے بجائے کچھ سوچنے کے خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ اب ان کی بچی اپنی عمر کے لحاظ سے کچھ نارمل طرح کے کام کرنے لگی ہے۔ پچاس ساٹھ سال کی بڑھیا بننے سے اس نے توبہ کر لی ہے اور اگر میری بات کا یقین نہیں آرہا تو خود مڑ کر دیکھ لو۔" مرتضیٰ کی بات پر اس نے سر گھما کر پیچھے دیکھا تو لاؤنج کی گلاس وال سے لگے پاپا اور علی ان دونوں ہی کو دیکھ رہے تھے۔ دونوں کے چہرے خوشی سے کھلے ہوئے تھے۔

اس نے اپنی آج تک کی زندگی میں پاپا اور علی کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا تھا جتنا وہ آج نظر آرہے تھے۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر علی نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا تھا اور وہ بھی ایک دم مسکرا دی تھی۔ مرتضیٰ گاڑی میں بیٹھ چکا تھا وہ بھی بڑے سکون سے اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔ اور اندر کھڑے پاپا اور علی نے اس لمحے بڑی شدتوں سے اللہ کا شکر ادا کیا تھا جس نے تابیہ کو اس کی سوچ کو تبدیل کر کے ان پر احسان عظیم کیا تھا۔ اب وہ انشاء اللہ ایک نارمل زندگی گزارے گی۔ فطرت سے منہ نہیں موڑے گی۔ اب کسی بھی رشتے سے متعلق وہ بے تحاشا جذباتی ہو کر شدتوں سے نہیں سوچا کرے گی اور پاپا کو لگ رہا تھا آج وہ اپنی پیاری حمیرا کے سامنے سرخرو ہو گئے ہیں۔ تابیہ نے اپنی منزل پالی تھی۔ آگے زندگی کا راستہ بڑا ہموار اور پھولوں بھرا تھا۔